علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم

طلوعِ اسلام

زیرِ ادارت سید نذیر نیازی

خاص عنوانات

استحکام ملت

از حضرت علامه اقبال مدظله

سیاحت اندلس

از مولوی غلام یزدانی ناظم محکمه آثار قدیمه حیدر آباد

عرب جدید از سینٹ جان فلبی

روس کا جمہوری تغیر از لوئی فشر

ایک ادبی تشخیص از رفیع الدین ہیر

لیمپ (افسانه)

رجال و مشاہیر، تاریخ و سیاست وغیره

فروری ۱۹۳۶

طلوع اسلام

ایک ماہوار رسالہ مشتمل بر حیات ملیہ اسلامیہ

جلد ۱ | فروری ۱۹۳۶ء | عدد ۲

پہلا نمبر اکتوبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا

نہایت ضروری اعلان

یہ طلوع اسلام کا دوسرا نمبر ہے جس کے ساتھ اس کی باقاعدہ اشاعت کی ابتدا کر دی گئی ہے۔ آئندہ ہر مہینے کا پرچہ اسی مہینے کی چوتھی تاریخ تک شائع ہوتا رہیگا۔ گویا اب مارچ کے پرچے کے لئے ۴ مارچ کا انتظار کرنا چاہیے۔

لیکن اس سے بھی اہم تر یہ کہ طلوع اسلام کی اس اشاعت کے ساتھ ہی اس کا ایک ضمیمہ زیر طباعت ہے یہ حضرت علامہ اقبال مدظلہ کے اس بیان پر مشتمل ہے جس میں انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کے ان اعتراضات کا جواب دیا ہے جنمیں تحریک قادیان کے علاوہ خود اسلام کے سیاسی اور اجتماعی تصورات زیر بحث آگئے ہیں ہم نے اس بیان میں حضرت علامہ کی ان تحریروں کا بھی اضافہ کر دیا ہے جو قادیانی نزاع کے متعلق وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں مگر جن سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ طلوع اسلام کا یہ ضمیمہ حجم میں غالباً چار جزء سے کم نہ ہوگا بایں ہمہ اس کی قیمت صرف ۴ر مقرر کی گئی ہے تاکہ مسلمانوں میں بکثرت اسکی اشاعت ہو سکے۔ خریداران طلوع اسلام کی خدمت میں یہ ضمیمہ مفت پہنچے گا لیکن ہمیں توقع ہے کہ انکی وساطت سے اسکے بہت سے نسخے فروخت ہو جائینگے۔ حضرت علامہ کا یہ بیان اسلام کے حقائق و معارف کا ایک ایسا نادر مجموعہ ہے جسکی روشنی میں کفر و اسلام کے علاوہ ہماری سیاست و معاشرت اور کئی ایک دوسرے مسائل کے متعلق مسلمانوں کی صحیح حیثیت ہمیشہ کے لئے واضح ہو جاتی ہے۔

چندہ سالانہ صہ — ششماہی تے — ممالک غیر سے عہ — فی پرچہ ۸ر

طابع و ناشر سید نذیر نیازی — مطبوعہ حبیب برقی پریس دہلی

مقام اشاعت دفتر رسالہ طلوع اسلام قرولباغ نئی دہلی

فہرست

جلد ۱۰ فروری ۱۹۳۶ء عدد ۲

تصویر — جامع کوبے، جاپان — ۵

اعتذار و تشکر	شذرات	۳، ۷
نعرۂ اسد	اسرار توحید (رباعیات)	۱۲، ۵۲

مقالات

استحکام ملت	حضرت علامہ اقبال مدظلہ العالی	۱۳
سیاحت اندلس	مولوی غلام یزدانی۔ ایم۔ اے۔ ناظم محکمۂ آثار قدیمہ قلمرو آصفیہ	۱۷
مذاہب عمرانی اور ملت اسلامیہ	راغب احسن ایم۔ اے	۲۸
ریگ تکبیر (وحدت انسانی)	چودھری غلام احمد پرویز بی۔ اے	۴۰
نسائیات — عورت کی حیثیت	شیخ سراج الحق۔ بی۔ اے	۵۳
افسانہ — لیمپ	سید نصیر احمد۔ بی۔ اے	۵۶

بحث و نظر

ایک ادبی تنخیص	رفیع الدین سپیر	۶۳
نظریہ اضافیت جدید	پروفیسر فضل الدین قریشی۔ ایم۔ ایس سی علیگ	۶۹

جہان گزراں

رجال و مشاہیر — جلالت الملک سلطان ابن سعود ، آغا محمد صفدر ۷۴،۷۵

آثار و مقالات — اسکب ۷۸

تاریخ و سیاست

۱۔ عرب جدید سینٹ جان فلبی ۷۹، حبش، جاپانی محکمۂ اطلاعات، روس کا جمہوری تغیر ۸۵، ۹۲، ۹۵

مراسلات — جامع کوبے جاپان، ایک پنجاہ سالہ اسکیم ۱۰۰

تنقید و تبصرہ — بچوں کا تحفہ، ساربان، جوہر، مبلغ ۷۳

اعتذار و شکر

طلوع اسلام کا پہلا پرچہ وسط اکتوبر ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اس وقت اگرچہ اس کی اشاعت میں کسی تاخیر کا مطلق خیال نہیں تھا لیکن بعد میں کچھ کاروباری سہولتوں اور کچھ اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ طلوع اسلام کے اغراض و مقاصد اور اس کی روش و ترتیب کے متعلق قارئین و احباب اور ملت کی صحیح رائے معلوم ہو جائے اس کی اشاعت قصداً ملتوی کر دی گئی۔ یہ طریق عمل اردو صحافت کی عام روش سے الگ ضرور ہے لیکن ہم بوجوہ اس پر مجبور تھے۔ بہرکیف ہم ان تمام معاصرین کے شکرگزار ہیں جنھوں نے ازراہ کرم طلوع اسلام کے متعلق اپنی صحیح رائے کا اظہار کیا۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے وہ معاصر بھی جنھوں نے کسی وجہ سے ابھی تک ہماری درخواست پر توجہ نہیں کی اپنی بے اعتنائی کا سلسلہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یہ دیکھ کر بے حد مسرت ہوتی ہے کہ طلوع اسلام کے مقاصد اور اس کی روش کو ملک میں ہر جگہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔

خریداران طلوع اسلام کے ہم بالخصوص ممنون ہیں کہ ان کو نومبر ۱۹۳۵ء سے لیکر اب تک دوسرے نمبر کا انتظار رہا لیکن اس زحمت انتظار کے باوجود انھوں نے رسالے کے متعلق کسی قسم کی بدگمانی کا اظہار نہیں کیا یہ اس امر کی دلیل ہے کہ انھیں طلوع اسلام کی امداد و اعانت دل سے منظور ہے۔ بایں ہمہ اس غیر معمولی تاخیر کے لئے ہم واقعی ان سے معذرت خواہ ہیں۔ رسالے کی آئندہ اشاعت کے متعلق ایک اعلان کسی دوسری جگہ موجود ہے۔ یہاں بغیر کسی تکلف کے یہ عرض کر دیا جائے کہ جو حضرات اس وقت تک طلوع اسلام کا سالانہ چندہ ادا کر چکے ہیں۔ ان کی خدمت میں اب دسمبر ۱۹۳۶ء تک رسالہ حاضر ہوتا رہے گا۔ گویا سہولت حساب کے لئے طلوع اسلام کی تمہیدی اشاعت یعنی اشاعت اکتوبر ۱۹۳۵ء کو جنوری کا نمبر تصور کرنا چاہئے۔

قدردانان طلوع اسلام کو ہم سے شکوہ ہے کہ رسالہ کی زبان اور طرز ادا بالعموم دشوار اور غیر مانوس الفاظ سے پر ہے۔ انھیں یہ معلوم نہیں کہ ہمارے بعض وقت پسند اور علم دوست احباب کے نزدیک ابھی طلوع اسلام کا معیار نہایت پست ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ رسالے کی نئی ترتیب ان حضرات کو پسند آئے گی۔ رہی زبان کی دشواری سو اس کے متعلق گذارش یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک خاص مقصد ہے اور اس مقصد کو صحت کے ساتھ پیش کرنے کے لئے مختلف افکار سے بحث کرنا ضروری ہے۔ ایسا کرنے میں مضمون نگار چند غیر مانوس

الفاظ اور بعض علمی اصطلاحات کے استعمال پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بایں ہمہ قارئین کو یقین رکھنا چاہیے کہ ہم طلوع اسلام کے مطالب کو جہاں تک ممکن ہوا عام فہم اور دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے رہیں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ رسالے کی موجودہ ترتیب میں ہم شاید ایک حد تک اس کوشش میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے بعض معاصرین اور علیٰ ہذا بعض احباب نے یہ اندیشہ ظاہر کیا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم طلوع اسلام کے ذریعے کسی خاص جماعت یا ادارے کی مخالفت کرنا چاہتے ہیں۔ انکی اس بدگمانی کی اگرچہ کوئی حقیقت نہیں پھر بھی ہم ان کی تسلی کے لئے یہ عرض کر دیں کہ ہمارا مسلک اس قسم کی ہنگامہ آرائیوں سے بالکل الگ ہے۔ اختلاف خیال کو ہم بہرحال جائز سمجھتے ہیں اور یوں بھی ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اگر کوئی چیز اسلام اور مصالح اسلامی کے منافی ہو تو اس پر دیانتداری کے ساتھ گرفت کرے۔

قارئین اجازت دیں تو ایک بات ہم بھی ان سے عرض کریں۔ انھیں خوب معلوم ہے کہ طلوع اسلام میں کوئی چیز ایسی نہیں جو مذاق عامہ کی تسکین و اطمینان کے لئے کافی ہو۔ اور اگر اس کا کوئی مقصد ہے تو صرف یہ کہ مسلمانوں کی ان نہایت ہی مقدس اور گہری آرزوؤں کا اظہار کرے جنکو کچھ انکی بے زبانی اور کچھ خود غرض اہل سیاست نے دبا رکھا ہے کیا ان حالات میں ان کا یہ فرض نہیں کہ وہ طلوع اسلام کی کامیابی کا ہمیشہ خیال رکھیں؟ ہمیں یقین ہے کہ انکی معمولی سی کوششوں سے اس کا حلقہ اشاعت بہت تیزی کے ساتھ بڑھ سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو رسالے کی معنوی خوبیوں کے ساتھ اس کے ظاہری محاسن میں بھی نہایت دلپسند اور نظر فریب اضافہ ممکن ہے۔

تعزیت۔ ہمیں یہ لکھتے ہوئے بیحد افسوس ہوتا ہے کہ شروع دسمبر میں ہمارے عزیز سید محمود بہاری کا دفعتہً انتقال ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم بہت چھوٹی عمر میں جامعہ آیا تھا اور اس کا شمار نہایت ذہین، محنتی اور خوش اخلاق طلبا میں ہوتا تھا۔ طلوع اسلام سے مرحوم کو خاص محبت تھی۔ ہم اس صدمے میں انکے والد ماجد قاضی سید محمد حسین صاحب رئیس ٹربہٹ (گیا) سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ اللہ تعالےٰ کی مشیت تھی کہ انھیں اپنی زندگی میں ایک جوان بیٹے کا غم دیکھنا پڑا۔ اُمید ہے وہ رضائے الٰہی پر صابر و شاکر رہتے ہوئے اس مصیبت کو حوصلے کیساتھ برداشت کرینگے۔ اللہ تعالےٰ انھیں اطمینان قلب عطا فرمائے آمین

اَللّٰہُ اَکْبَرُ

اِنَّمَا یَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوۃَ

جامع کوبے، جاپان کا ایک منظر

۱۱، اکتوبر ۱۹۳۵ء کو کوبے میں جاپان کی پہلی مسجد کا افتتاح ہوا۔ اس تقریب میں اسلامیان کوبے کے علاوہ میئر کوبے، برطانوی اور مصری قنصل، جاپانی اور غیر جاپانی ملتوں کے مخصوص نمائندے موجود تھے۔ خطبۂ افتتاحیہ میاں عبدالعزیز بیرسٹرایٹ لاء (سابق صدر آل انڈیا مسلم لیگ) نے پڑھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

شذرات

استحکام ملت ـــــ پنڈت جواہرلال نہرو کا شمار ہندوستان کے ان چند سیاسی رہنماؤں میں ہوتا ہے جن کی بے تعصبی اور خلوص نیت مسلم ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انکے اشتراکی (سوشلسٹ) عقائد سے بہت کم ہندوستانیوں کو اتفاق ہوگا۔ بایں ہمہ اس بات کا ہمیشہ اعتراف کیا گیا ہے کہ انھیں غریبوں کے دکھ سے واقعی دکھ ہوتا ہے اور وہ حقیقتاً اس امر کے آرزومند ہیں کہ ہندوستان میں ایک ایسا معاشی اور سیاسی نظام قائم ہو جائے جس سے ہماری موجودہ بیروزگاری افلاس، محکومیت اور غلامی کا خاتمہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اختلاف رائے اور اختلاف مسلک کے باوجود مسلمانوں نے پنڈت جی کی ذات کو ہمیشہ دلی عزت اور محبت کی نظر سے دیکھا ہے۔ لیکن پنڈت جی میں ایک خامی ہے۔ ان کی ساری تعلیم و تربیت انگلستان میں ہوئی اور یہ اس تعلیم کا اثر ہے کہ وہ جس چیز کو دیکھتے ہیں مغرب کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ ہیرو اور کیمبرج کے قیام سے پنڈت جی میں یہ صلاحیت ہی باقی نہیں رہی کہ وہ اپنے سوا دوسروں کی مشکلات کا اندازہ کر سکیں۔ اس معاملہ میں وہ خالص انگریز ہیں۔ چونکہ انھیں کسی نہ کسی طرح اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ اشتراک یعنی سوشلزم ہی دنیا میں انسانی بیماریوں کا ایک علاج ہے لہٰذا وہ اس کی بجائے کسی دوسری حقیقت کو حقیقت تسلیم کرنے پر بھی آمادہ نہیں۔ آخرت کی انھیں فکر نہیں، مذہب انکے نزدیک سرمایہ دارانہ ذہنیت کا ایک آلہ ہے اور ہندوستان کا "فرقہ دارانہ مسئلہ" یعنی مسلمانوں کی یہ خواہش کہ وہ اس ملک میں عزت اور آزادی کے ساتھ زندگی بسر کریں، "طبقہ متوسط" کا پیدا کردہ گویا محض ایک معاشی سوال ہے۔

یہ خیالات جس قدر عجیب ہیں عقلی اعتبار سے انکی سطحیت اسی قدر عیاں ہے۔ ان سے ایک ایسی ذہنیت کا اظہار ہوتا ہے جو اپنے تخیلات کے نشے میں دنیا بھر سے آنکھ بند کر لیتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ تخیلات عملی زندگی سے متعلق ہیں لہٰذا پنڈت جی کسی مسئلے پر گفتگو کرتے کرتے دفعتہً تشدد بلکہ بعض مرتبہ ایک تحقیر آمیز رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ ماڈرن ریویو کلکتہ میں انھوں نے علامہ اقبال کے اس بیان پر جو پچھلی گرمیوں میں احرار اور قادیانیوں کی باہمی کشمکش کے متعلق شائع ہوا تھا جس انداز سے تنقید کی ہے نہایت درجہ یاس انگیز ہے۔ افسوس ہے کہ اس بحث میں پنڈت جی کا قلم ذاتیات سے بھی محفوظ نہ رہ سکا۔ علامہ موصوف کے سامنے جو مسئلہ تھا صرف یہ کہ ختم نبوت کا انکار کس طرح وحدت ملی میں حارج ہو رہا ہے۔ پنڈت جی نے اس مسئلے کو سمجھنے کی بجائے خود مفتی بنکر یہ کہنا شروع کیا کہ اگر استحکام ملت کا انحصار اس امر پر ہے کہ مسلمانوں کی زندگی احکام شریعت پر مبنی ہو تو اس وقت نہ ترک مسلمان ہیں نہ ایرانی۔ یہ بات ابتک سمجھ میں نہیں آئی کہ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے ہز ہائنس سر آغا خاں کی طرف کیوں اشارہ کیا۔ بہرکیف یہ قصہ اگر یہیں ختم ہو جاتا تو غنیمت تھا لیکن اپنے تیسرے مضمون میں پنڈت جی نے جس طرح اظہار خیال کیا ہے اس سے انکی تشددانہ ذہنیت بے نقاب ہو جاتی ہے۔ اول انھوں نے یہ سمجھکر کہ اسلام گویا انسان کی مادی ترقیات کا منکر ہے تمام اہل مذہب کو دعوت دی ہے کہ اگر ان کا جی چاہے تو ایک ہو کر دیکھ لیں، وہ دنیا کی نئی رَو کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکیں گے اور پھر علامہ اقبال سے پوچھا ہے کہ آیا شرعی اعتبار سے مسلمانوں کا دینی استحکام احتساب اور ملحدین کے استیصال کے لئے تعذیبی عدالتوں کے بغیر قائم رہ سکے گا؟ تعجب ہوتا ہے یہ پنڈت جی کے خیالات ہیں جنھوں نے حال ہی میں اپنی صاحبزادی کے نام چھوٹے چھوٹے خطوں کی شکل میں اقوام عالم کی ایک تاریخ لکھی ہے ہماری ناچیز رائے میں یہ جرأت صرف انھیں کو ہو سکتی تھی کہ وہ اپنی معلومات کے زعم میں ہندوستان کے پنڈتوں، کیتھولک عیسائیوں اور مسلمانوں کو باعتبار ان کے سیاسی اور اجتماعی تصورات کے ایک صف میں کھڑا کر دیتے۔ یوں بھی اس بحث کی علمی حیثیت سے قطع نظر کر لیجئے تو ایک دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر پنڈت جواہر لال نہرو — جن کی بلندی ذات کے ہم اس وقت بھی معترف ہیں اور جن سے اظہار شکایت کرتے ہوئے ہمیں فی الواقع رنج ہوتا ہے — کی تنگی نظر کا یہ عالم ہے تو عام ہندوؤں کی ذہنیت کو مدنظر رکھتے ہوئے اقوام ہند میں کسی مستقل اتحاد یا بالفاظ دیگر ایک پائیدار مفاہمت کا کہاں تک امکان ہے؟

ہندوستان اور پاکستان ـــــ بہرکیف ہمیں پنڈت جواہر لال نہرو کے اعتراضات سے کوئی بحث نہیں اس لئے کہ ان کی تردید خود علامہ اقبال مدظلہٗ نے اپنے تازہ بیان میں نہایت مکمل طور پر کردی ہے علامہ موصوف کے اس بیان میں سے چند ضروری اقتباسات ایک الگ مضمون کی شکل میں قارئین کی نظر سے گذرینگے۔ یہاں ہمیں ان کے ایک ارشاد کی طرف خصوصیت کے ساتھ اشارا کرنا مقصود ہے اور وہ یہ کہ "پنڈت جی اور قادیانی دونوں اس امر کو ناپسند کرتے ہیں کہ ہندوستان کے شمال مغربی اقطاع میں مسلمانوں کے اندر کوئی سیاسی اور دینی استحکام پیدا ہوسکے ... ہندوستانی نیشنلسٹ اس بات کو کبھی گوارا نہیں کریگا کہ یہاں (یعنی شمال مغربی ہندوستان میں) مسلمان سیاسی اعتبار سے حصول استقلال کی خواہش کریں۔" علامہ اقبال کے اس ارشاد سے ہمارے سامنے وہ مسئلہ آجاتا ہے جس کی انتہائی شکل "وطن پسند ہندوستان" اور "پاکستان" کی اصطلاحوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ وطن پسندیعنی نیشنلسٹ ہندوستان کا تقاضا یہ ہے کہ اس ملک کی تمام قومیتیں ایک واحد قومیت میں گم ہوجائیں اور اس طرح پشاور سے ڈھاکہ اور قراقرم سے راس کماری تک اکثریت یعنی ہندوؤں کے تغلب کا راستہ کھل جائے۔ پاکستان اسکے برعکس اس انتہائی اور زمین پرست وطنیت کے خلاف ایک ردعمل ہے جس کا مقصود یہ ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی اقطاع یعنی پنجاب، سندھ، بلوچستان، کشمیر اور صوبہ سرحد کو ایک ساتھ ملاکر "ہندو" ہندوستان سے الگ ایک جُداگانہ اسلامی ریاست طیار کی جائے۔ ان دونوں تحریکوں کے منافی اگر کوئی تیسری چیز ہے تو اشتراکیت یعنی سوشیلیزم جس نے معاشیات کی حدود سے تجاوز کرکے اب زبردستی اخلاق، مذہب اور روحانیت پر بھی تصرف جمانا شروع کردیا ہے بادی النظر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان تینوں تحریکوں کی بجائے ایک "متحدہ" ہندوستان کی تجویز آسان بھی ہے اور قابل قبول بھی لیکن اگر اس سے مقصود ایک ایسی حکومت کا قیام ہی جو اقوام ہند کی باہمی رضامندی سے قائم ہو اور جس میں انکی جداگانہ ہستی محفوظ رہے تو عملاً اس کی انتہا خود بخود ایک ہندوانہ اسلامی ہندوستان (جو پاکستان کا اصل مقصد ہے) میں ہوگی گو اصولاً اس قسم کی کسی تفریق کو غیر ضروری قرار دیا جائیگا۔ بہرکیف ہندوستان کے آئندہ سیاسی نظام کی یہ مختلف صورتیں ہیں جو سمجھ میں آتی ہیں لیکن ۱۹۲۰ء کی تحریک خلافت کے ساتھ "مشترک قومیت" کی جو اصطلاح وجود میں آئی تھی (ہندو مسلمانوں میں ایک سیاسی اتحاد کی ضرورت پر زور دینے کے لئے) اس کا مفہوم و مدعا آج تک سمجھ میں نہیں آیا۔ عوام الناس کو خوش کرنے اور سیاسی جوڑ توڑ کے لئے یہ اصطلاح بہت موزوں ہے لیکن اگر اس تصور

کی حمایت فی الواقع دل سے منظور رہے تو افسوس ہے اس علم و دانش پر جو ذہن انسانی کو مستقل کی بصیرت اور صحت فکر سے عاری کر دے۔ مشترک قومیت کیا چیز ہے؟ اگر اس سے دو قوموں کا اتحاد مقصود ہے تو کیوں نہ اس امر کو صاف صاف تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستان کا داخلی مسئلہ حقیقت میں ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ آخر ہمیں اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہوئے خوف کیوں آتا ہے؟ ہم کیوں نہ اپنی جداگانہ انفرادیت کا اعلان کر دیں اور ایک خالی از معنی اصطلاح کے چکر میں ہمارے افکار و خیالات اور جذبات کے اندر جو انتشار رونما ہے اُس کو دور کرنے کی کوشش کریں کیونکہ اس طرح ہمارے دینی اور ملی استحکام میں جو کمزوری پیدا ہوتی ہے وہ صرف اسلام ہی سے نہیں بلکہ سب سے بڑی غداری ہے خود اپنی ذات سے۔ لیکن اگر مشترک قومیت سے مراد ہے ہندو اور مسلمانوں کے امتزاج سے ایک نئی قومیت کی ترکیب تو سوال یہ ہے کہ اس جدید قومیت کی اساس کس چیز پر ہوگی؟ کیا واقعی مسلمانوں کو اس امتزاج پر آمادہ ہو جانا چاہیے؟ کیا اسلامی تعلیمات اسکی اجازت دیتی ہیں؟ یہ امتزاج کیونکر رونما ہوگا اور ہندوستان کی مختلف تہذیبوں کے کن عناصر کو باقی رکھا جائیگا اور کیوں؟ مذہب کی حیثیت اس امتزاج کے بعد کیا رہے گی اور شریعت کے جن اجزا کو ترک کر دیا جائیگا ان میں کیا خرابی ہے؟ یہ بہت سے مسائل ہیں سے چند بڑے بڑے سوالات ہیں جن پر غور کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ گذشتہ دس برس میں تو ہمیں اس اتحاد و امتزاج کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ ہندوستان کی پچھلی تاریخ میں اکبر اور دارا شکوہ کی "متحدہ قومیت" کا تذکرہ ضرور سننے میں آیا ہے لیکن اس کی صحیح حقیقت کا بھی آج تک پتہ نہیں چلا۔ کیا اکبر کی سیاست اور دارا شکوہ کا تصوف واقعی ہندو مسلم تہذیبوں کے امتزاج پر مبنی تھا؟ کیا اس امتزاج کی عملی شکل صوبہ متحدہ کی وہی "معاشرت" ہے جہاں ہندو اور مسلمان ایک زبان بولتے اور تقریباً ایک قسم کا لباس پہنتے ہیں (یا تھے)؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اکبر اور دارا شکوہ کی ذات سے کسی اور ہی تحریک کا پتہ چلتا ہو۔ سہولت بحث کے لئے آپ تاریخ سے قطع نظر کر لیجئے تب بھی معلوم ہو جائیگا کہ جو لوگ اس قسم کی اصطلاحوں کو استعمال کرتے رہتے ہیں انھیں خود بھی اپنے مافی الضمیر کا پتہ نہیں۔ انکی ذہنیت بہ حد کی سی ہے جو اپنی خوئے سوال کو کسی طرح بھی چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے، گویا ایک سرکش اور بے یقین ذہنیت جو اپنی تحقیق و تفتیش کے زعم میں خود اپنے آپ پر ظلم کرتی ہے۔ حالانکہ اگر اتحاد و تعاون سے مقصود محض ایک سیاسی مفاہمت ہے، یہ

خیال ہنیں کہ ہم اپنی حیات ملی کی بنا کسی نئے اصول پر رکھیں خواہ وہ بے روح اشتراکیت ہو یا زمین پرست وطنیت دونوں صورتوں کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان "ہندوؤں" میں جذب ہو جائیں — تو ہمیں ہر لحاظ سے اپنے مسلمان ہونے کا اقرار کر لینا چاہیے تاکہ ہم اپنی اخلاقی اور دینی اصلاح کے ساتھ ان مسائل کی طرف بھی توجہ کر سکیں جن کا تعلق ہماری مادی ضروریات اور ملی اقتدار سے ہے۔

اتحاد اسلامی اور تجدید خلافت اسلامیہ — مسلمانان ہند کی ملی ترقی اور انکی آئندہ زندگی کا انحصار تین باتوں پر ہے۔ اول یہ کہ وہ اپنی اندرونی اصلاح اور تعمیر و تہذیب کی طرف متوجہ ہوں۔ دوسرے یہ کہ وہ دنیا اور بالخصوص اسلام کی عالمگیر قوت پر نظر کرتے ہوئے اس امر کو کبھی فراموش نہ کریں کہ ملل اسلامیہ کا مستقبل ہمیشہ ایک دوسرے سے وابستہ رہے گا اور تیسرے یہ کہ ہم اقوام ہند میں اپنی صحیح حیثیت کو متعین کر لیں جس کا سب سے زیادہ سہل اور دل پسند راستہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی مفاہمت ہے۔ یہ مفاہمت جیسا کہ ہمیں یقین ہے ایک نہ ایک دن ہو کر رہے گی۔ اقوام اسلامیہ کی باہمی وابستگی کیلئے ہم ان تحریکوں کی طرف اشارہ کرینگے جو عالم اسلام میں ترک و عرب، ایرانی و افغانی اور دوسرے اسلامی ممالک کے انفرادی نظم و انضباط — جس نے شروع شروع میں قومیت اور وطنیت کی شکل اختیار کر رکھی تھی — کے بعد اب اپنی تہذیب و تمدن اور مخصوص شعائر کی حفاظت اور اسلام کے مادی و روحانی تعلقات کی مضبوطی و استواری کے لئے رونما ہو رہی ہیں۔ یہ ارادی یا غیر ارادی طور پر انہیں محسوسات کا نتیجہ ہے کہ اسلامیان یورپ کو ایک کانفرنس کے انعقاد کی ضرورت پیش آئی، جنوبی سلافیہ کی مسلمان اقلیت ملی اعتبار سے حکومت میں اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اور اب یہ نہایت ہی مسرت خیز اطلاع آئی ہے کہ جمہوریہ ترکیہ، ایران، عراق اور افغانستان میں ایک سیاسی اتحاد کی گفت و شنید ہو چکی ہے جس کی تکمیل کے بعد مصر، نجد و حجاز، یمن اور فلسطین کو بھی شمولیت کی دعوت دی جائے گی۔ اس اتحاد پر رائے زنی کرنا ابھی پیش از وقت ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دنیائے اسلام کے بدلتے ہوئے حالات کے متعلق مزید تفصیلات کا انتظار کر لیا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا ان سے یہ نتیجہ مرتب نہیں ہوتا کہ اتحاد اسلامی ایک حقیقت ہے اور عالمگیر خلافت اسلامیہ کی تجدید کسی نہ کسی شکل میں ہو کر رہے گی۔ طلوع اسلام کی آئندہ اشاعتوں میں ہم ان مسائل سے کسیقدر تفصیل کے ساتھ بحث کرینگے۔ انشاء اللہ العزیز۔

نعرۂ اسد

وطن میں عام پھر اقبال کا ترانہ کریں

اُٹھو مقابلۂ گردشِ زمانہ کریں
حیات و موت کو یا بستۂ قضا نہ کریں

جہاں نے اہلِ خرد کا کمال دیکھ لیا
اب اس کو واقفِ شانِ قلندرانہ کریں

فنا یہی ہے کہ دل میں نہ ہو یقین بقا
بقا یہی ہے کہ اندیشۂ فنا نہ کریں

مگر یہی ہے تقاضائے گرمیٔ پرواز
کریں تو برقِ تپاں ہی پر آشیانہ کریں

جو اپنے دن ہی کسی کے سپرد کر بیٹھیں
وہ رند کیا ہوسِ محفلِ شبانہ کریں

عجب نہیں کہ یہی بجلیاں حوادث کی
ہمارے توسنِ ہمت کو تازیانہ کریں

اسی سے ملتِ خوابیدہ جاگ اُٹھے شاید
وطن میں عام پھر اقبال کا ترانہ کریں

دلوں کو مخزنِ اسرارِ معرفت کر کے
زباں کو وقفِ نواہائے عاشقانہ کریں

نہ مل سکا طلبِ نیم گرم سے کچھ بھی
اب ایک بار تقاضائے والہانہ کریں

جمالِ یار تو بیتاب خود نمائی ہے
پر اہلِ دل بھی تو پیدا کوئی بہانہ کریں

مزا ہو صاحبِ خانہ بھی دل میں گھر جائے
حرم میں جا کے نہ خالی طوافِ خانہ کریں

اسی لئے ہوا اسدؔ رفعتِ جبیں کی طلب
کہ سجدہ کر کے بلند اُن کا آستانہ کریں

اسدؔ ملتانی

استحکام ملت

از افادات قلم حضرت علامہ اقبال مدظلہ العالی

ہم نے ابھی عرض کیا تھا کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے ان استفسارات کے جواب میں جو ماڈرن ریویو کلکتہ میں شائع ہوئے ہیں حضرت علامہ اقبال مدظلہ نے ایک طویل بیان سپرد قلم فرمایا ہے۔ اس بیان نے بعنوان اسلام اور احمدیت ایک طویل مضمون کی شکل اختیار کرلی ہے جسے جریدہ "اسلام" لاہور نے حال ہی میں شائع کیا ہے اور جس کا اردو ترجمہ بہ اجازت علامہ موصوف طلوع اسلام کے ایک خاص ضمیمے کی شکل میں زیر طبع ہے۔ سردست ہم قادیانیت اور کفر و اسلام کی بحث کو چھوڑتے ہوئے قارئین کی توجہ اس نہایت ہی اہم بیان کے چند ایسے اقتباسات کی طرف منعطف کرائیں گے۔ جن کا تعلق ان تبدیلیوں سے ہے جو ترکوں میں رونما ہوئیں اور جن کی بنا پر بعض نافہم حلقوں نے غلطی سے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ اب ترکوں کو خدانخواستہ اسلام سے کوئی عقیدت نہیں رہی۔ اس امر کو واضح کرتے ہوئے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کو اسلام اور تاریخ اسلامی سے کوئی واقفیت نہیں۔ علامہ محترم فرماتے ہیں (ہم ان اقتباسات کو ملخصاً پیش کر رہے ہیں۔ مدیر)

۱۷۹۹ء میں اسلام کا سیاسی زوال مکمل ہوگیا لیکن یہ اس کی اندرونی قوت کا ایک ناقابل انکار ثبوت ہے کہ مسلمانوں کو اس کا فوراً ہی احساس بھی ہوگیا۔ انیسویں صدی میں سرسید احمد خان، سید جمال الدین افغانی اور مفتی عالم جان پیدا ہوئے۔ سید احمد خاں کی طرح مفتی عالم جان کا بھی یہی خیال تھا کہ روسی مسلمانوں کو جدید تعلیم حاصل کرنی چاہئے۔ سید جمال الدین کی ذات البتہ ان سے مختلف تھی۔ انکی روح آج بھی دنیائے اسلام میں سرگرم کار ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ اسکی انتہا کہاں ہوگی۔

بہرکیف ان جلیل القدر ہستیوں کا خیال تھا کہ تین قوتیں ہیں جو دنیائے اسلام پر حاوی ہیں اور جن کا ازالہ اسلام کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ اول **ملائیت** جس نے اجتہاد کا دروازہ بند کر رکھا ہے۔ ثانیاً ایک زوال پذیر **تصوف** جس نے مسلمانوں کے اندر حقائق حیات کی بجائے طرح طرح کے اوہام اور ساقط العمل پیدا کردی ہے اور ثالثاً **سلاطین اسلام** جو اپنی ذاتی اغراض کے لئے قوم کو غیروں کے ہاتھ بیچتے رہتے ہیں۔

یہاں یہ ممکن نہیں کہ ان بلند مرتبت حضرات کی اصلاحی کوششوں سے جو تبدیلیاں رونما ہوئیں انہیں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے۔ ہاں ایک بات ظاہر ہے اور وہ یہ کہ زاغلول پاشا، مصطفےٰ کمال اور رضا شاہ کا ظہور ایک حد تک انھیں کوششوں کا نتیجہ ہے۔ ان کے پیش رو مصلحین کا کام تعبیر و استدلال اور تشریح و توضیح کرنا تھا لیکن جن شخصیتوں کا ظہور اب ہوا ہے وہ اگرچہ علم میں ان سے بہت پیچھے ہیں مگر نہایت صحیح الفطرت ہیں اگر ضرورت پیش آئے تو زور اور جبر سے کام لیکر بھی ان باتوں کو منوا سکتے ہیں جو دنیا کے موجودہ حالات میں ناگزیر ہیں۔ اس قسم کے لوگ اگرچہ غلطیاں کرتے ہیں لیکن بعض اوقات انکی غلطیاں بھی فائدے سے خالی نہیں ہوتیں۔ یہ درست ہے کہ مسلمانان عالم جدید خیالات سے متاثر ہوئے لیکن سید احمد خاں، سید جمال الدین افغانی اور انکے ہزار ہا شاگرد جنھوں نے اسلامی دنیا کی ذہنی اور روحانی فضا کو ایک نئی شکل دینے کی کوشش کی تھی افرنگی مآب مسلمان نہیں تھے، بلکہ انکی ساری تعلیم قدیم علماہی کے زیر نگرانی ہوئی تھی۔ لہذا ترکوں میں جو انقلاب رونما ہوا اور جس کا جلد یا بدیر دوسرے اسلامی ممالک میں ظاہر ہونا ضروری ہے خود اسلام ہی کی اندرونی قوتوں کا نتیجہ ہے۔ لہذا سوال یہ ہے کہ آیا ہندوستان سے باہر تمام مسلمان اور بالخصوص ترک کیا واقعی اسلام کو خیرباد کہہ چکے ہیں جیسا کہ پنڈت جواہرلال نہرو کا خیال ہے۔ انھیں یہ معلوم نہیں کہ اسلامی نقطۂ نظر سے کسی شخص کا مسلمان یا کافر ہونا ایک فقہی اور قانونی سوال ہے جس کا انحصار اس بات پر ہے کہ کیا اس کو اسلام کے بنیادی اصولوں کا اقرار ہے؟ اگر کوئی شخص توحید اور ختم رسالت پر ایمان رکھتا ہے تو بڑے سے بڑا ملا بھی اسے دائرہ اسلام سے خارج نہیں کر سکتا۔ ممکن ہے پنڈت جی کے ذہن میں ان اصلاحات کا خیال ہو جو اتاترک مصطفےٰ کمال کی طرف منسوب کیجاتی ہیں۔ اندریں حالات یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ترکوں کے مادی رجحانات فی الواقع اسلام کے منافی ہیں؟ ایک غیر مسلم کے لئے اس بات کا سمجھنا بہت مشکل ہے کہ مسلمانوں کے مادی رجحانات شعور ذات کی ایک صورت ہیں۔ اسلام کو ان رجحانات سے کوئی خطرہ نہیں۔ قرآن پاک کا صاف و صریح ارشاد ہے کہ "دنیا میں تمہارا جو حصہ ہے اسے مت چھوڑو" پھر کیا لاطینی رسم الخط کی ترویج یا قدیم لباس کا ترک اس بات کی دلیل ہو کہ ترک اب مسلمان نہیں رہے حالانکہ بحیثیت ایک مذہب نہ اسلام کا کوئی وطن ہے نہ بحیثیت جماعت اسکی کوئی زبان بالخصوص وضع قطع۔ قرآن پاک کو ترکی زبان میں تلاوت کرنیکی ایک مثال بھی اسلامی تاریخ میں موجود ہے گو میرے نزدیک یہ ایک نہایت ہی شدید غلطی ہے اس لئے کہ غیر مغربی زبانوں میں سوائے عربی کے اور کسی کا مستقبل نہیں۔ اس ضمن میں تو اب یہ خبریں آنے لگی ہیں

کہ ترکوں نے پھر عربی متن کو اختیار کر لیا ہے۔ ممکن ہے تعدد ازدواج کی تنسیخ یا علما کے لئے "پروانوں" کا حصول اسلام کے خلاف قرار دیا جائے حالانکہ فقہ اسلامی کی رو سے ایک اسلامی ریاست کا امیر شریعت کی "اجازتوں" کو روک سکتا ہے بشرطیکہ اسے یقین ہو کہ لوگ ان سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے۔ رہا علما کیلئے لائسنس یا پروانوں کا حاصل کرنا سو یہ ایک ایسی بات ہے کہ اگر حضرت شاہ ولی اللہؒ یا امام ابن تیمیہ آج زندہ ہوتے تو ان کا دل کس قدر خوش ہوتا۔ مشکوٰۃ میں ایک حدیث ہے کہ ایک اسلامی حکومت کا امیر یا اس کے مقرر کئے ہوئے لوگ ہی وعظ و تبلیغ کر سکتے ہیں۔ البتہ سوئس قانون کا اختیار کرنا ضرور ایک خطرناک غلطی ہے اور ترکوں کی طرح تمام دنیائے اسلام کو ابھی اسلامی قانون وراثت کے نامعلوم معاشی پہلوؤں کو سمجھنا ہے جو فان کریمر کے نزدیک فقہ اسلامی کی ایک نہایت درجہ اچھوتی شاخ ہے۔ رہا تنسیخ خلافت اور مذہب اور ریاست کی علیحدگی کا مسئلہ سو اس کو سمجھنے کے لئے اول اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ اسلام اور شہنشاہیت دو الگ اور مختلف چیزیں ہیں اور ترکوں نے جس خلافت کو ختم کیا ہے یہ وہ نظام شہنشاہیت تھا جو بنو امیہ کے ساتھ وجود میں آیا البتہ ادارہ خلافت کے متعلق ترکوں کا اجتہاد یہ ہے کہ اب عالمگیر خلافت کا قیام ممکن نہیں مذہب اور ریاست کے معاملہ میں بھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ ایسا کرنے میں ترکوں نے یورپ کا اتباع کیا ہے یا محض سیاسی اور دینی وظائف کی تقسیم مدنظر ہے جیسا کہ دنیائے اسلام میں قاعدہ رہا ہے بہرکیف یہ بات ناممکن سی معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان اس بارے میں یورپ کی تقلید کریں گے جس نے روح اور مادہ کو دو الگ وجود قرار دے رکھا ہے۔

ترکوں کی ان اصلاحات کے بعد اب ہم ان وطنی اور نسلی تخیلات سے بحث کریں گے جو بقول پنڈت جواہر لال نہرو ایران اور ترکی میں کام کر رہے ہیں اور جن سے گویا یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ ان ممالک میں اب اسلام کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ تاریخ انسانی کا طالب علم اس امر سے خوب واقف ہے کہ اسلام کا ظہور اس وقت ہوا جب دنیا کی وہ تہذیبیں جن کا دارومدار قرابت اور بادشاہ پرستی پر تھا مٹ رہی تھیں۔ اسلام نے اتحاد انسانی کی بنا گوشت اور پوست کے رشتوں پر نہیں رکھی بلکہ انکے قلب و نفس پر۔ اندریں حالات اسلام نے انسان کو یہ پیغام دیا کہ "نسل پرستی کو چھوڑ دو ورنہ آپس کی لڑائیاں تمہیں ہلاک کر دیں گی"۔ یہ کہنا مبالغے میں داخل نہیں کہ اسلام نے اپنے مخصوص ادارات سے کام لیتے ہوئے فطرت کی نسل سازیوں کو ہمیشہ شکست دینے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ اسلام کو جو کامیابی انسانوں کی ایک برادری طیار کرنے میں ہوتی ہے، بدھ مت یا مسیحیت کو

دو ہزار برس میں بھی نہیں ہو سکی۔ کیا یہ ایک معجزہ نہیں کہ ایک ہندی مسلمان کو اختلاف نسل اور اختلاف زبان کے باوجود مراکش پہنچ کر بھی کوئی اجنبیت محسوس نہیں ہوتی؟ بایںہمہ اسلام نے نسل کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور اسکے ازالے کی طرف بتدریج قدم اُٹھایا ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے "ہم نے تم کو شعوب و قبائل میں محض تعارف کے لئے تقسیم کیا ہے، خدا کے نزدیک بڑا وہی ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔" لہذا نسل کا مسئلہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں اور اس سے جو خرابیاں رونما ہوتی ہیں ان سے بچنے کی ایک ہی ترکیب ہے اور وہ یہ کہ ہم اسلامی طریق عمل کو اختیار کرتے ہوئے نسلیت کو مٹانے کی کوشش کریں۔ مصطفےٰ کمال کے دل میں اگر اتحاد توران کا جذبہ کام کر رہا ہے تو محض ایک سیاسی حربے کے طور پر اور میرے نزدیک یہ جواب ہے اتحاد سلافیت، اتحاد المانویت یا اینگلو سیکسینت کا۔

جہاں تک وطنیت کا تعلق ہے اسلام نے کبھی اس جذبے کی مخالفت نہیں کی کہ انسان اپنے وطن سے محبت نہ رکھے۔ اسلام صرف اس وطنیت کا مخالف ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ مذہب کو انسان کی اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ترکی، ایران، مصر اور دوسرے اسلامی ممالک میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اگر یہاں اقلیتیں ہیں تو اہل کتاب کی جن سے اسلام نے معاشرتی روابط حتیٰ کہ ازدواج تک کی اجازت دی ہے مسلمانوں کیلئے یہ مسئلہ صرف ان ممالک میں رونما ہوتا ہے جہاں انکی اقلیت ہے۔ لہذا یہاں انکی یہ خواہش کہ وہ اپنی جداگانہ انفرادیت کو محفوظ رکھیں ہر اعتبار سے حق بجانب ہے۔

میری رائے میں اب یہ مسئلہ پورے طور پر واضح ہو جاتا ہے کہ دنیا میں اسلام کی وحدت بدستور قائم ہے۔ یہ وحدت جیسا کہ میں نے کسی دوسری جگہ بیان کیا ہے اسلام کے دو بنیادی عقائد (توحید اور ختم نبوت) پر بنی ہے جن میں پانچ ارکان اسلامی کا اور اضافہ کر لینا چاہیے۔ اس وحدت کو اگر کسی نے توڑا تو ایران میں بہائیوں اور ہندوستان میں قادیانیوں نے۔ بہرکیف اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ وحدت اسلامی نے عملی اعتبار سے ایک ایسی مشترک روحانی فضا قائم کر دی ہے جس میں تمام دنیائے اسلام شریک ہے۔ اس سے بلاد اسلامیہ کا ایک سیاسی مجموعہ طیار ہو سکتا ہے جو ممکن ہے ایک عالمگیر ریاست یا اسلامی ریاستوں کی ایک انجمن کی شکل اختیار کرلے اور جنکے باہمی معاہدات سیاسی اور معاشی مصالح پر مبنی ہوں۔ یوں پتہ چلتا ہے کہ دین اسلامی نے اپنی سیدھی سادھی ہیئت کا جو تصور قائم کیا ہے وہ کس طرح ہر زمانے میں اپنے لئے ایک نیا راستہ طیار کر لیتی ہے۔

سیاحت اندلس

ہم اپنے فاضل کرم فرما جناب مولوی غلام یزدانی صاحب ایم۔ اے۔ ناظم محکمۂ آثار قدیمہ دولت آصفیہ حیدرآباد دکن کے دل سے ممنون ہیں کہ انھوں نے اندلس کی پر از معلومات سیاحت اور حالات سفر کی اشاعت کیلئے طلوع اسلام کو منتخب فرمایا۔ ہمیں یقین ہے قارئین کرام صاحب موصوف کے سلسلۂ مضامین کو پسند فرمائیں گے۔ سیاحت اندلس کی آئندہ قسطیں انشاء اللہ نہایت باقاعدگی کے ساتھ طلوع اسلام میں شائع ہوتی رہیں گی۔ مدیر

بلنسیہ

میں ۲۷ دسمبر (۱۹۲۲ء) کو بلنسیہ پہنچا۔ یہ شہر اپنے نام کے صوبہ کا دارالخلافہ ہے۔ زمین خشک اور اکثر جگہ پتھریلی ہے لیکن مسلمانوں نے اپنے زمانہ میں نہروں کا یہاں ایسا جال بچھایا تھا کہ سارا خطہ جنت بن گیا ہے۔ مجریط سے جو اکسپریس رات کو روانہ ہوتی ہے وہ بلنسیہ نو بجے کے قریب پہنچتی ہے۔ میری آنکھ جب صبح کو کھلی تو کھڑکیوں میں سے ایک عجب سماں نظر آیا۔ نارنگیوں کے درخت لدے کھڑے تھے اور جہاں تک نظر کام کرتی تھی نارنگیاں ہی نارنگیاں نظر آتی تھیں سعدیؒ نے اپنے قصیدے میں "فی الشجر الاخضر نار" لکھا ہے لیکن یہاں تمام جنگل میں آگ لگی ہوئی تھی۔ میں سات بجے کے قریب جاگا ہونگا۔ اس وقت سے دو گھنٹہ تک ریل کے دونوں جانب باغوں کا سلسلہ جاری رہا۔ چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر عورتیں اور بچے نارنگیاں بیچ رہے تھے اور ہسپانیوی پیسہ کی جس کو عثمانیہ آنہ کے برابر ہی سمجھنا چاہیے آٹھ دیتے تھے۔ بلنسیہ سے نارنگیاں بکثرت انگلستان اور یورپ کے شمالی ملکوں میں جاتی ہیں اور وہاں میوے کے طور پر استعمال ہونے کے علاوہ دساور کے واسطے مربے شربت ست تیار ہوتے ہیں۔ خود ہسپانیہ میں میں نے اس ملک کا تیار کیا ہوا Orange Marmalade یا Jam نہیں دیکھا۔

مسلمانوں نے بلنسیہ کو ۷۱۴ء میں فتح کیا اور پونے تین سو برس تک یہ سلاطین قرطبہ کے ماتحت رہا لیکن جب انکی حکومت میں ضعف آیا تو بعض غلام یہاں خود مختار حاکم بن بیٹھے جن کے زمرہ میں مبارک مظفر اور لبیب کے نام قابل ذکر ہیں ۱۰۲۱ء سے بلنسیہ میں عامری خاندان کا دور شروع ہوا اور چونسٹھ برس کے اندر چار بادشاہ تخت پر بیٹھے عبدالعزیز المنصور اس خاندان کا بانی تھا۔ شاہان عامری کو بلنسیہ میں استقلال سے حکومت کرنی نصیب نہیں ہوئی۔ چنانچہ ۱۰۶۵ء میں المامون والیٔ طلیطلہ اس صوبہ کو دبا بیٹھا۔ اور دس برس تک بلنسیہ میں اس کا عمل رہا۔ لیکن بعد میں ابوبکر بن عبدالعزیز نے شاہان طلیطلہ کے قبضہ سے اس کو نکالا اور عامری خاندان کی حکومت پھر قائم کی۔ ۱۰۸۵ء میں بلنسیہ کی حکومت عامری خاندان کے

ہاتھ سے ہمیشہ کے لئے نکل گئی اور چند سال تو یہاں القادر بن اسمٰعیل والیٔ طلیطلہ کا عمل رہا جو اپنے صوبہ کی حکومت کھو چکا تھا لیکن بعد میں ابن حجاف کے زیر صدارت جمہوری حکومت قائم ہوئی آخر اس کو بھی فلاح نہ ہوئی اور بلنسیہ مسلمانوں کے قبضے سے نکل کر عیسائیوں کے زیر حکومت ہوگیا۔ مرابطین کے زمانہ میں بلنسیہ پر پھر اسلامی قبضہ ہوا لیکن ۱۲۳۸ء میں یہ صوبہ ارغون کی عیسائی سلطنت میں مستقل طور سے ضم ہوگیا۔

اسلامی مورخین نے بلنسیہ کے باغوں اور سرسبزی کی بے حد تعریف کی ہے اور یہاں کے رصافہ اور پل کا بھی ذکر کیا ہے[1] ایک سڑک رصافہ کے نام سے اب تک موجود ہے لیکن اس کی حیثیت اتنی بدل گئی ہے کہ اس میں کوئی اسلامی شان باقی نہیں پلوں کا بھی یہی حال ہے بعض مسلمانوں کے زمانہ کے ہیں لیکن ترمیم و تجدید کی وجہ سے کوئی خصوصیت نمایاں نہیں ہے۔ شہر بہت پر رونق ہے اور تجارتی کاروبار خوب ہے۔ بلنسیہ کا کپڑا اور چینی کا کام اسلامی زمانہ میں نہایت مشہور تھا۔ اب بھی یہ صنعتیں باقی ہیں لیکن جو کام پہلے ہاتھ سے ہوتے تھے اب کل سے ہونے لگے ہیں۔

بلنسیہ کے آثار قدیمہ میں دو دروازے قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام Torres de Serranos اور دوسرے کا Torres de Cuarte ہے۔ یہ دونوں عمارتیں چودھویں یا پندرھویں صدی کی یادگار ہیں لیکن ان کی وضع میں رومانوی استحکام اور ہیبت پائی جاتی ہے Torres de Serranos میں عمارتی ترتیب اس طرح ہے کہ بیچ میں دروازہ ہے جس کی کمان تنگ ہے اور دونوں جانب ہشت پہل برج ہیں برجوں پر درمیانی حصہ میں مرغولوں کا سلسلہ ہے اور دروازے کے محراب کے اوپر قوطی طرز کی جنت کاری ہے اس دروازے کی زمانہ مابعد میں بہت کچھ ترمیم و تجدید ہوئی ہے جس سے اسکی قدیم شان میں فرق آگیا ہے۔ دوسرے دروازے میں ابھی تک اپنی قدیم سادگی اور عظمت باقی ہے۔ پہلوؤں کے دونوں برج مدور ہیں اور بیچ کی کمان نہایت مستحکم ہے۔ میری نظر میں یہ عمارت شان شوکت اور مضبوطی کے لحاظ سے مینکینز (مراکو) اور قاہرہ کے قدیم دروازوں کا مقابلہ کرتی ہے حقیقت میں ان سب عمارتوں میں رومانوی طرز تعمیر کا اثر موجود ہے۔

مذہبی عمارات کے زمرہ میں Cathedral سب پر فوقیت رکھتا ہے۔ یہ تیرھویں صدی میں قدیم مسجد کی بنیادوں پر بننا شروع ہوا تھا۔ لیکن بعد میں اتنی ترمیم و تجدید ہوئی کہ عمارت بالکل نئی ہوگئی ہے اور گو بہت خصوصیات

---

[1] عربی ادب کے شائقین کے لئے ابوالمطرف ابن عمیرۃ المخزومی کا خط جو ابن الابار کے نام ہے۔ اور جس میں بلنسیہ کی تباہی کا ذکر ہے پڑھنے کے قابل ہے ابن الابار کا جواب بھی نہایت نفیس ہے۔ ان کے علاوہ ابو یحییٰ صفوان بن ادریس نے جو اندلس کے شہروں کا مناظرہ لکھا ہے اس میں بھی بلنسیہ کا ذکر ہے۔ "دبر صافتی وجسری اعارض مدینۃ السلام فاجمعوا علی الانقیاد لی والسلام۔" (نفح الطیب جلد اول صفحات ۱۰۵–۱۰۷ – جلد دوم صفحات ۷۸۴–۷۹۱)

اکا دکا کہیں کہیں نظر پڑجاتی ہیں۔ شہر کے وسط میں Micalet (یا Miguelete) نامی ایک منار بھی ہے۔ ارتفاع (۱۵۲ فیٹ) کے لحاظ سے یہ خاصا شاندار ہے۔ لیکن عمارت کا بالائی حصہ بدوضع ہے منار کے اوپر سے شہر کا نظارہ بہت پرلطف معلوم ہوتا۔ Cathedral سے متصل ایک اور کنیسہ ہے جس کا نام Capilla de Neustra Senora de los Desamparados ہے اس عمارت کے ایک حصہ پر عظیم الشان گنبد ہے اور باقی حصے پر بیضوی شکل کی چھت ہے کنیسہ کے اندر سنگ مرمر کے کام کی افراط ہے اور زمانہ مابعد کا اطالوی طرز نمایاں ہے۔ اس عمارت کو Cathedral سے وہی تعلق ہے جو فلارنس کے Camp-anilla کو وہاں کے Cathedral سے حالانکہ خوبصورتی کے لحاظ سے بلنسیہ کا Cathedral اور Capilla فلارنس کے Cathedral کے پاسنگ برابر بھی نہیں۔ ہسپانیہ کی پندرہویں صدی کے بعد کی تمام عمارتوں میں اطالوی طرز تعمیر کی نقل کی گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال کے بعد اہل ہسپانیہ اپنا خاص قومی طرز قائم نہ کرسکے۔

بلنسیہ کی تجارتی عمارات میں ریشم کا بازار جس کا ہسپانوی نام Lonja de la Seda ہے قرون وسطی کے قومی طرز کا اچھا نمونہ ہے۔ عمارت کی اندرونی ہیئت ایک بڑے ایوان کی سی ہے جس کو پانچ پانچ ستونوں کی دو قطاروں نے تین دالانوں پر تقسیم کردیا ہے۔ ستون نہایت بلند اور ستوان ہیں اور ان کی بلدار (Spiral fluting) ساخت نے ان کی خوبصورتی کو اور بھی بڑھا دیا ہے چھت پر ستاروں کی شکل منقش کی گئی ہے۔ جن کی ابتدا مصری زمانہ سے ہے چھت کے نیچے دیواروں پر جو کتبہ لکھا ہوا ہے وہ نہایت دلچسپ ہے

"ابدی زندگی وہی حاصل کرے گا جس نے کبھی دھوکا نہ دیا ہو اور سود نہ لیا ہو"

ایک تجارتی عمارت کے لئے یہ کتبہ نہایت موزوں ہے۔

اس عمارت میں ایوان کے علاوہ ایک بلند مینار بھی ہے۔ جس کی بیرونی ساخت چوکور ہے (Lonja) ریشم کے بازار کے سامنے ایک کنیسہ ہے۔ اس کی وضع نشاۃ جدید (Renaissance) کے آخری طرز کی ہے گرجا اور ریشم کے بازار کے بیچ میں ترکاری اور پھلوں کی منڈی ہے۔ دن کے گیارہ بجے یہاں بڑی رونق ہوتی ہے۔ خریداروں کا ہجوم سودے والوں کی آوازیں معاملہ پر تکرار اور ہیرا پھیری عجب پرلطف معلوم ہوتے ہیں۔ ہسپانیہ والوں کی بسیط زندگی کا اندازہ کرنے کے لئے یہ مناظر دیکھنے نہایت ضروری ہیں نو

نشاۃ جدید (Renaissance) کے طرز کی عمارات میں Audencia بیت الحکومت بھی

قابل ذکر ہے۔ اس میں متعدد ایوان ہیں جن کی چھتیں زرنگار ہیں اور دروازوں اور کھڑکیوں پر جالی کا کام نہایت نفیس ہے۔ صدر ایوان کی چھت پر سونے کا کام نہیں ہے لیکن لکڑی کے کٹاؤ کا کام بہت اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اس ایوان میں اٹھارہویں صدی کے وسط تک صوبہ کی حکومتوں کے اجلاس ہوتے رہے۔

میں بلنسیہ کی یونیورسٹی کو بھی دیکھنے گیا۔ عمارت سُرخ اینٹ کی ہے۔ لیکن جابجا صاف جلا شدہ پتھر کی چنائی سے تنوع پیدا ہوگیا ہے۔ اندر صحن میں ایک نہایت خوبصورت سنگ مرمر کا بت بھی نصب ہے۔ پڑھائی کا معیار بہت اعلیٰ نہیں۔ قانون فلسفہ اور طب کے درس ہوتے ہیں۔ طالبعلموں کی تعداد دو ہزار کے قریب ہے۔ فرڈنینڈ ہفتم نے سانڈ کی لڑائی کے فن کے لئے بھی یونیورسٹی میں ایک شعبہ قائم کر دیا تھا۔

بلنسیہ میں نقاشی کا بھی قدیم زمانہ سے چرچا رہا ہے اور ویلسکت کے پیدا ہونے سے قبل یہاں کے مصور ہسپانیہ کے دوسرے صوبوں کے مصوروں کو مطلق نہیں مانتے تھے نقاشی کے متحف میں (Museo Provincial de Printer) مرقعوں کا ذخیرہ نہایت وسیع ہے۔ لیکن ترتیب اچھی نہیں۔ اس مجموعہ میں Ribera کی تصاویر کے علاوہ جس کا رنگ مخصوص ہے۔ مجھے Lopez اور March کے مرقعے پسند آئے Lopez کی تصاویر میں رنگوں کی آمیزش اور خدوخال کی لطافت میں Raphael رفائیل کا طرز نمایاں ہے March نے بعض تصاویر میں Murillo کا اتنا تتبع کیا ہے کہ دونوں کی خصوصیات میں تفریق کرنی مشکل ہو جاتی ہے۔

سنگتراشی کے دلدادوں کے لئے بلنسیہ کے متحف Museo Provincial میں ایک بت نہایت عجیب ہے۔ اس کی ہیئت گو نفیس نہیں لیکن وضع قطع نہایت قدیم ہے اور بعض فنیقی مورتوں کی وضع سے جو میں نے تونس اور سلطہ کے عجائب خانوں میں دیکھیں ملتی جلتی ہیں۔ اس بت کی تصویر استاذ گومیز مورینو کی کتاب Material de Arqueologi'a Espanola میں دی ہوئی ہے۔

بلنسیہ کے رہنے والے ہمیشہ سے شوقین مزاج رہے ہیں۔ ناچنے گانے کا چرچا ہے۔ مسلمانوں نے شہر کا نام مدینۃ الطرب رکھا تھا سولھویں صدی میں یہاں Nocturnes شبگیروں کے نام سے ایک مشہور تھیٹر قائم ہوا۔ اب بھی بعض بعض رقص خانوں Cabaret میں سو سو ناچنے والیاں موجود ہیں۔ عورتیں حسین ہوتی ہیں۔ لیکن جسم ذرا گداز ہوتا ہے جس سے وہ خود بھی بیزار ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں کی ایک مثل ہے کہ "گوشت گھاس ہے اور گھاس پانی"، مطلب یہ کہ بھاری ڈیل رطوبت کی پوٹ ہے حسن میں داخل نہیں۔ عرب کا شاعر تو جسم کے گداز ہونے کی بے حد تعریف کرتا ہے۔ چنانچہ حماسہ میں جابجا اشعار موجود ہیں جہاں بھاری ڈیل کی تعریف کی گئی ہے۔ ظریف مزاج ابونواس کے بھی اپنے مشہور اشعار ہیں جن کو مجھے

یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ،،اردات ثقال،، کی تعریف کرتا ہے۔

لقنت

۳۰ر دسمبر کو میں مرسیہ کا قصد کر کے بلنسیہ سے روانہ ہوا لقنت میرے پروگرام میں نہ تھا لیکن ریل سیدھی نہیں جاتی تھی مجھے اول ال ابن سائن پر گاڑی بدلنی پڑی اور پانچ گھنٹے کے قریب انتظار کرنا پڑا۔ ال ابن سائن چھوٹا سا گاؤں پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے چند گھر پختہ ہیں باقی کھپریلیں ہیں۔ زمین سنگریلی ہے کاشتکاروں نے پلوں میں گدھے اور خچر لگا رکھے تھے۔ زیتون کا جنگل گاؤں کے قریب بہت دلکش ہے وہیں ایک درخت کے نیچے میں بیٹھ گیا اور گاڑی کا انتظار کرتا رہا۔

اسپین میں سوائے ان ریلوں کے جو بڑے بڑے شہروں کو جاتی ہیں۔ چھوٹے شہروں کے لئے ریل کا انتظام اچھا نہیں۔ رفتار بہت سست ہے۔ وقت کی پابندی نہیں۔ گاڑیاں سب چاریوں کی ہیں۔ جو چلتے وقت بہت ہلتی ہیں پوشش بھی خراب ہے اور سب میں زیادہ تکلیف یہ کہ جاڑے کے موسم میں گاڑیوں کے گرم رکھنے کا معقول بندوبست نہیں۔ ہندوستان والوں کو یہ شکایت زیادہ اہم نہ معلوم ہوگی لیکن جب پارہ انجمادی حد سے نیچے اترا ہوا ہو۔ اور انسان کے بدن میں سردی کی شدت سے قفلی جمنے لگے۔ اس وقت ٹھنڈی گاڑیوں میں بیٹھنے سے جو طبیعت زچ ہو جاتی ہے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ فرانس اور انگلستان میں بجلی کے ذریعہ سے گاڑیوں کو گرم رکھنے کا نہایت عمدہ انتظام ہے۔ گدوں تکیوں اور فرش سب کے نیچے کہربائی نل نصب ہوتے ہیں اور گاڑی میں بیٹھنے کے بعد باہر چاہے برف پڑے یا پالا اندر مطلق محسوس نہیں ہوتا اسپین کی Express Trains میں تو یہ انتظام ہے۔ لیکن اور گاڑیوں میں صرف اول و دوم درجے کے مسافروں کے لئے گرم پانی کے لمبے لمبے ٹنکے فرش کے قالینوں کے نیچے رکھ دیتے ہیں۔ تاکہ پیر گرم رہیں لیکن یہ جلد ٹھنڈے ہو جاتے ہیں

میں شام کو سات بجے کے قریب ال ابن سائن سے روانہ ہوا۔ اور گیارہ بجے کے قریب لقنت پہنچا چونکہ اس وقت کوئی گاڑی مرسیہ نہیں جاتی تھی۔ اس لئے رات کو وہیں ٹھہر گیا۔ یہ شہر چھوٹا سا ہے لیکن صوبہ کا صدر مقام ہے اور تجارتی بندرگاہ ہے۔ اس لئے چہل پہل خوب ہے۔ میں رات کو جب ہوٹل میں پہنچا تو قمار بازوں کی محفل گرم تھی۔ پانسے پھینک رہے تھے کھلاڑی اپنے خیالات میں ایسے منہمک معلوم ہوتے تھے کہ دنیا اور ما فیہا کی خبر نہ تھی ہسپانیہ میں جوئے کا بیحد رواج ہے سڑکوں پر بچے طرح طرح سے جوا کھیلتے ہیں۔ مہذب لوگوں کے لئے کوئی قہوہ خانہ کوئی رقص گاہ کوئی انجمن ایسی نہیں جہاں جوئے کا انتظام نہ ہو۔ شریف عورتیں بھی تفریح کے طور پر جوا کھیلتی ہیں۔ ال ایسکوریل میں ایک روز برف خوب پڑ رہی تھی لوگ باہر نہیں جا سکتے تھے ایک مسن عورت اور اس کا بارہ تیرہ برس کا بچہ میرے کمرے کے برابر کے

کمرے میں مقیم تھا۔ ان سے ملنے کے لئے شہر سے ایک اور شریف خاتون اور ان کی صاحبزادی آئیں۔ تھوڑی دیر بعد اس کمرے میں ایسا اودھم مچنا شروع ہوا کہ میں پریشان ہوگیا اور اپنے کمرے سے اٹھ کر مطالعہ کے ایوان میں چلا آیا۔ سہ پہر کو چائے پینے کے لئے سب لوگ وہاں آئے اور چائے پینے کے بعد پانسے پھینکنے شروع ہو گئے تب میں سمجھا کہ غل شور اس خاص تفریح کی برکت سے تھا۔ لاٹری کا بھی بے حد رواج ہے۔ اسٹیشنوں گلی کوچوں باغوں تماشہ گاہوں جہاں جاؤ لوتریا لوتریا (Lotteria) کی آواز چلی آتی ہے۔ اور لنگڑے لولے اپاہج لوٹریوں کی کتابیں لئے ہوئے موجود ہیں اطالیہ اور یونان میں بھی جوئے کی کثرت ہے لیکن ہسپانیہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔

اسلامی زمانہ میں لقنت مرسیہ کے صوبہ میں شامل تھا۔ ۷۱۸ء میں فتح ہوا اور ۱۲۰۴ء تک مسلمانوں کے قبضہ میں رہا۔ ۱۳۳۱ء میں مسلمانوں نے پھر اس کو لینا چاہا لیکن مہم کامیاب نہ ہوئی۔ شہر کے شمال مشرقی جانب ایک ننگی خشک پہاڑی ہے جس کی وضع جبل طارق (جبرالٹر) سے ملتی جلتی ہے۔ پہاڑی کے اوپر اسلامی وضع کا چھوٹا سا قلعہ ہے سمندر کے کنارے کھجوروں کا خیابان ہے اور ٹریم اور گاڑیوں کے لئے وسیع سڑک ہے شہر کی تجارتی عمارتیں اسی سڑک پر واقع ہیں کلب (Casino) کی عمارت جو بالکل جدید ہے۔ مجھے پسند آئی۔ عربی وضع میں بنائی گئی ہے۔

لقنت میں جس روز میرا قیام رہا وہ دسمبر کی اکتیسویں تاریخ تھی۔ سال کو الوداع کہنے کے لئے بعض مذہبی رسوم کھجوروں والے خیابان میں ادا کی گئی تھیں۔ بچوں بوڑھوں مرد و زن کا بے حد ہجوم تھا۔ ایک پیانو بھی بیچ سڑک کے لے آئے تھے۔ پہلے مذہبی گیت سنجیدگی سے گائے گئے۔ لیکن بعد میں بچوں اور کم سن شوخ مزاج لڑکیوں نے پھول برسانے شروع کئے اور سوانگ بھی بھرے گئے جس سے جلسہ کی رنگت میلے کی سی ہوگئی ؛

مرسیہ

میں ۳۱ دسمبر کی شام کو ہی مرسیہ پہنچ گیا۔ لقنت سے ۴۸ میل کے فاصلہ پر ہے۔ ریل تین گھنٹے میں پہنچاتی ہے۔ مرسیہ میں اسلامی زمانہ میں کیا کچھ رونق نہ ہوگی لیکن اب نہ قصر باقی ہے۔ نہ مسجد کا پتہ ہے شہر کے نواح میں باغات کی تاہم کثرت ہے۔ ابو بحر صفوان بن ادریس نے اندلس کے شہروں کے مناظرے میں مرسیہ کا ذکر کیا ہے۔ باغوں کی شادابی کے بارے میں لکھتے ہیں "فلی روض النضیر- والمرای الذی ماله نظیر- وزنقاق التی صار مثلها فی الآفاق- وتبرقع وجه جمالها بغرة الاصفاق -،، دریائے شقورہ شہر کے پہلو میں بہتا ہے اور لق و دق ننگی پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔ مرسیہ کا صوبہ بہت خشک اور بنجر بلا ہے۔ بعض مؤلفین نے اس سرزمین کو شیر کی کھال سے نسبت دی ہے۔ سیاہ تاریک وادیاں دھاریوں سے مشابہ ہیں جو بھورے رنگ کی سطح پر پھیلی ہوئی ہیں۔ بے رونق پہاڑوں اور آفتاب کی تمازت کو دیکھ کر عرب کی سرزمین یاد

آجاتی ہے۔ پانی کی بیحد قدر ہے۔ اور سونے کی طرح بکتا ہے۔ لورقہ میں جو مرسیہ کے صوبہ کا ایک قصبہ ہے۔ آبپاشی کا ٹھیکہ سالانہ دیا جاتا ہے۔ جس روز ہراج ہوتا ہے۔ کاشتکاروں کا عجب ہجوم ہوتا ہے۔ صبح ٹھیک آٹھ بجے آبپاشی کا عہدہ دار ایک بڑے کمرے میں آکر اجلاس کرتا ہے۔ اس کمرے میں سوائے چند کرسیوں اور ایک میز کے کچھ سامان اور فرش فروش نہیں ہوتا۔ نیلامیہ کتاب مقدس کا حوالہ دیکر بولی بولنا شروع کرتا ہے۔ اور ادھر بولی بولی گئی اور چیخ پکار شروع ہوئی۔ منہ میں جھاگ بھر آتے ہیں آوازیں بیٹھ جاتی ہیں۔ گلے کی رگیں پھول آتی ہیں۔ آنکھیں ابلی ہوئی اور تیوریوں سے وحشت مایوسی اور اضطراب ٹپکتا ہے۔ بولیوں کو بڑھانے کے لئے ہاتھ اور انگلیاں علیحدہ چلتی ہیں۔ اس غل وشور میں جب عہدہ دار دیکھتا ہے کہ بولی مناسب حد پر پہنچ گئی تو وہ ہراج کے ختم کرنے کا اشارہ کر دیتا ہے اور اشارے کے ساتھ ہی خاموشی ہو جاتی ہے۔ کاشتکار باوجود اس قدر کشمکش کے حکومت کا بڑا احترام کرتے ہیں سب ننگے سر کھڑے رہتے ہیں۔ کوئی تنباکو نہیں پیتا اور جب تک بولی شروع نہیں ہوتی بات نہیں کرتا۔ کمرے سے باہر گلی میں جو لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں وہ بھی یہ احترام واجب سمجھتے ہیں۔

مرسیہ کے آثار میں صرف شہر کا بڑا کنیسہ (Cathedral) دیکھنے کے قابل ہے۔ یہ چودھویں صدی کی قوطی طرز کی عمارت ہے۔ لیکن سترھویں صدی میں غربی رُکار اور منارہ بنا دیئے گئے سرودگاہ کا لکڑی کا کام نفیس ہے۔ کنیسہ کے اندر ایک یادگاری گرجا ( ) بھی بہت خوبصورت ہے اس کو لورقہ کے قسیس نے سولہویں صدی کے شروع میں (۱۵۱۵ء) تعمیر کیا تھا۔ گرجا نشاۃ جدید کے آرائشی طرز کا اچھا نمونہ ہے سنگتراشی کا کمال اور لطافت دیکھکر دل پھڑک جاتا ہے۔

میں نے مرسیہ میں اکھاڑا بھی دیکھا جہاں سانڈوں کی لڑائی ہوتی ہے۔ یہ کئی منزل کی مدور عمارت ہے اور روما کے عظیم الشان اکھاڑے کی وضع کی بنی ہوئی ہے۔ مرسیہ کی آبادی نیس پنتیس ہزار کے قریب ہے۔ لیکن جب ہم اکھاڑے کی گنجائش کا خیال کرتے ہیں جس میں دس بارہ ہزار آدمی آرام سے بیٹھ سکتے ہیں تو ہم کو ہسپانیہ والوں کے شوق کا حال معلوم ہوتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں کو چھوڑ کر بعض قصبوں میں بھی Plaza de Tors موجود ہے۔ ہر سال ہزار کے قریب سانڈ اس کھیل کی نذر ہوتے ہیں۔ اور گھوڑے اس سے بھی کہیں زیادہ۔ اندلسیہ میں سانڈوں کی پرورش کا خاص انتظام ہے۔ پانچ برس سے کم عمر کا سانڈ لڑائی کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ امراء سانڈوں کی نسل اور خونخوار عادات قائم رکھنے کے لئے زر و دولت خرچ کرتے ہیں۔ انگلستان میں گھڑ دوڑ کا بڑا شوق امراء کے طبقے میں کچھ کم نہیں ہے لیکن سانڈوں کی لڑائی کا شوق ہسپانیہ میں عالمگیر ہے۔ امیر فقیر مرد عورت بچہ بوڑھا کوئی اس سے خالی نہیں۔

مجریط میں جس روز سانڈوں کی لڑائی کا تماشہ ہوتا ہے۔ اس روز شہر میں عجب چہل پہل ہوتی ہے اور اتنی خلقت نکل پڑتی ہے کہ تعجب ہوتا ہے اتنے لوگ کہاں سے آ گئے۔ گھنٹوں پہلے اکھاڑے کی جانب گاڑیوں موٹروں اور ٹریم کا تانتا بندھا ہوتا ہے اور پیدل چلنے والوں کی بھیڑ علیحدہ ہوتی ہے۔ یہ تماشہ اکثر موسم بہار میں ہوتا ہے۔ نازک اندامون کی پنکھیاں اور طرح بطرح کے لباس بعینہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ رنگ برنگ کی تیتریاں پروں کو حرکت دے رہی ہیں۔ وقت معین پر باجا بجتا ہے اور بلند آہنگ نغموں سے لوگوں کے دل ہلنے لگتے ہیں۔ پھر سانڈوں سے لڑنے والے سورماؤں کے پرے دنگل میں آنے شروع ہوتے ہیں ان کی زرق برق پوشاکوں پر جو لیس اور قیتوں کے کام سے لپی ہوتی ہیں آنکھ نہیں ٹھیرتی اول تو قدیم فوجی لباس میں دو سوار آتے ہیں۔ ان کے بعد وہ من چلے جو سانڈوں سے پیادہ لڑینگے۔ ان کے بعد گھڑ چڑھے جو گھوڑوں پر بیٹھ کر سانڈوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور آخر میں وہ جماعت جن کے پاس برچھیاں ہوتی ہیں یہ بھی پیادہ پا ہوتے اور وقتاً فوقتاً سانڈ کو جوش دلانے کے لئے اس کی گردن میں برچھی کا وار اس صفائی سے کرتے ہیں کہ لوگ ڈنگ ہو جاتے ہیں جب جلوس ختم ہو جاتا ہے تو بگل بجایا جاتا ہے۔ اس وقت اکھاڑے میں صرف تین گھڑ چڑھے جو سانڈ سے لڑینگے رہ جاتے ہیں سانڈ اپنے پنجرے سے چھوڑا جاتا ہے اور وہ پھنکارے مارتا ہوا اور منہ میں کف بھرے دم کو اونچا کئے ہوئے آتا ہے غصہ میں زمین کو روندتا ہے اور گھڑ چڑھوں کے سرخ لباس سے مشتعل ہو کر بجلی کی طرح حملہ کرتا ہے لیکن گھوڑے ایسے سدھے ہوتے ہیں اور سوار ایسے استاذ ہوتے ہیں کہ فوراً رخ بدل کر اس کے حملے کو بھالے پر لیتے ہیں۔ سانڈ غصہ میں اور بھی آگ ہو جاتا ہے اور پلٹ پلٹ کر حملہ کرتا ہے۔ لیکن ہمیشہ اس کے حملہ کی زد سے بچ جاتے ہیں۔ اکثر گھوڑا زخمی ہو جاتا ہے اور سینگ پیٹ سے پار ہو کر انتڑیاں نکل پڑتی ہیں۔ بعض دفعہ سوار بھی کاوہ دینے میں زمین پر آن رہتا ہے۔ اس وقت برچھیوں والے سانڈ سے بھڑ جاتے ہیں۔ ان کی چستی اور چالاکی دینے کے قابل ہے برچھی والا بعض اوقات وار کر کے بھاگتا ہے اور جست کر کے کٹہرے سے جو اکھاڑے کے گرد نصب ہوتا ہے نکل جاتا ہے۔ سانڈ بجلی کی طرح پیچھے آتا ہے۔ اور اس کا سر کٹہرے سے ٹکراتا ہے آخر میں جب سانڈ زچ ہو جاتا ہے۔ تو وہ بہادر آتا ہے جو سانڈ سے آخری مقابلہ کرتا ہے اس کے ایک ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے اور دوسری طرف سرخ رنگ کی ایک لمبی جھولی۔ یہ اول آ کر پہلے بادشاہ کو یا صدر مجلس کو مودبانہ سلام کرتا ہے۔ پھر سانڈ کی طرف رخ پھیر کر اپنی سرخ جھولی کو ہلا کر اسے برانگیختہ کرتا ہے۔ سانڈ حملہ کرتا ہے۔ لیکن ٹکر کپڑے پر پڑتی ہے اور کھلاڑی پینترا بچا کر نکل جاتا ہے۔ سانڈ بار بار حملہ کرنے کے بعد پھر اپنی دوڑ کو کم کر دیتا ہے اور کھلاڑی کے گرد آہستہ آہستہ چکر لگانے لگتا ہے۔ کہ کس طرح موقع پا کر دشمن کا کام تمام کر دے کھلاڑی سانڈ کے تیور اور نقل و حرکت کو سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ کس پہلو پر وار کرے گا۔

جب سانڈ بالکل زچ آجاتا ہے اور کھلاڑی اپنا کمال اور استقلال دکھا چکتا ہے۔ اُس وقت ایک آخری ہاتھ تلوار کا ایسا بھرپور لگاتا ہے کہ پھل قبضے تک اُتر کر سانڈ کے دل کے پار ہو جاتا ہے۔ حاضرین سے واہ واہ کا شور بلند ہوتا ہے اور آسمان گونج اٹھتا ہے۔ سانڈوں کی لڑائی کا ذکر بیسیوں کتابوں اور رسالوں میں موجود ہے نقاشوں نے تصویریں کھینچی ہیں۔ شعراء نے کھلاڑیوں کی تعریف میں قصائد نظم کئے ہیں۔ رومانوی زمانے کے کھیلوں اور کرتبوں کی یادگار اگر کوئی دنیا میں باقی ہے تو یہ رہ گئی ہے۔ اخلاقی مصلح اس کے ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ اور ایک دن اس کو مٹا کر چھوڑینگے۔ لیکن ہسپانوی اس تماشہ کا ایسا دلدادہ ہے کہ وعظ و پند کا احساس پر ذرا دیر میں ہوگا۔

مرسیہ کی تفریح گاہوں میں دو مقام نہایت پرفضا ہیں۔ ایک باغ جو دریائے شقورہ کے کنارہ پر ہے اور دوسرا بند جس کا ہسپانوی نام Malecon ہے۔ یہ کئی میل تک چلا گیا ہے۔ دن بھر یہاں میلہ سا لگا رہتا ہے ایک جانب دریائے شقورہ بہتا ہے اور دوسری جانب وادی ہے۔ جس میں گرم ملکوں کے تمام قسم کے میووں کے درخت موجود ہیں۔ نرنج نارنگی اور کھجوروں کی کثرت ہے۔ بند مسلمانوں کے زمانے کا ہے لیکن پچھلے پچاس برس میں شہر کی حفاظت کی غرض سے اس کی بہت ترمیم و تجدید ہوئی ہے۔ مرسیہ کے بازار کچھ زیادہ پررونق نہیں[5]۔

ہسپانیہ میں تازی کتوں Grey hounds کی ایک قسم کی نسل ہے جو دوڑنے اور شکار پکڑنے میں انگریزی تازی کتوں سے ہرگز کم نہیں۔ ہسپانوی زبان میں اس نسل کا نام Korga ہے۔ میں مرسیہ میں بند پر ٹہل رہا تھا۔ کہ ایک کاشتکار کو دیکھا کہ کتے کو ساتھ لئے جاتا ہے۔ اس کی خوبصورتی کو دیکھکر میں بے تاب ہوگیا اور چاہا کہ خرید لوں۔ ٹوٹی پھوٹی ہسپانوی زبان میں کچھ اشاروں سے بات چیت ہوئی۔ لیکن سودا طے نہیں ہوا۔ آخر میں اسے ہوٹل میں لے آیا اور دو پونڈ میں خرید لیا۔ کتا چند روز میرے ساتھ رہا۔ اور بہت مانوس ہوگیا۔ میں سفر میں تنہائی سے پریشان ہوگیا تھا۔ ایسے باوفا رفیق کی ہمراہی سے بہت خوش تھا کتے کو ریل میں اپنے ساتھ رکھا کرتا تھا۔ لیکن ایک دن بہت تیز ہوا چل رہی تھی اور پالا پڑ رہا تھا۔ میری گاڑی میں رات کے بارہ بجے کے قریب ایک مسافر آیا۔ کتے سے وہ ذرا چین بجبین ہوا اور کہا اسے کلب خانہ Dog Box میں بند کرا دیجئے تو اچھا ہوگا۔ اس کو کہنے کا حق تھا لیکن میں دل میں بہت بیزار ہوا کتے کو کلب خانہ میں بند کرا دیا۔ اس کے پٹڑے نیچے سے بھی کھلے ہوئے تھے اور سامنے کی سلاخوں میں بھی ہوا آتی تھی۔ کتا

---

[5] اسلامی زمانہ میں مرسیہ کپڑوں کی رنگائی اور چھپائی کے لئے مشہور تھا۔ اور یہاں کے بوریئے بھی دساور میں جاتے تھے جو فرش اور دیواروں کی زینت کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ مراکو میں بوریا بافی کی صنعت اب بھی خوب ہے میں آئندہ کسی لکچر میں انشاءاللہ مفصل ذکر کرونگا۔

ساری رات چیختا رہا۔ میں بھی تمام شب جاگا۔ صبح کو جب اُترا۔ تو کتے کے دونوں پچھلے پیر رہ گئے تھے اُسی وقت مالش وغیرہ کرائی اور گرم جگہ بٹھایا۔ شکایت رفع ہو گئی۔ لیکن میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ میں نے کتے کو دو ایک روز بعد ایک شوقین کو دیدیا۔

المدور

یہ ایک چھوٹا سا عربی وضع کا قلعہ ہے۔ نفح الطیب میں اس کا کئی جگہ ذکر آیا ہے۔ ریل کے راستے سے قرطبہ سے کوئی بیس میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ لیکن ابن سعید نے اپنی کتاب الحلة المذہبہ فی حلی مملکة قرطبہ میں المدور کا فاصلہ ۱۶ میل لکھا ہے[1]۔ میں نے عربی وضع کا قلعہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے پسند آیا۔ قلعہ آجکل مجریط کے ایک صاحب ذوق امیر کی ملک ہے۔ جو اس کی درستی کرا رہے ہیں اور بادشاہ کو نذر کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں۔ عوام کو قلعہ دیکھنے کی ممانعت ہے اور فوٹو لینے کی تو مطلق اجازت نہیں۔ میں نے چوری چھپے سے دو ایک فوٹو لئے۔ لیکن جیسا دل چاہتا تھا ویسے نہیں اُترے۔

قلعہ وادی الکبیر کے کنارے ایک پہاڑی پر واقع ہے جو نواح کی زمین سے کوئی چھ سات سو فیٹ بلند ہوگی ایک جانب اسی نام کا ایک چھوٹا سا قصبہ واقع ہے جس کی چار ہزار کی آبادی ہے۔ قلعہ کا موقع دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرف سے قرطبہ پر غنیم کے حملے کو روکنے کے لئے بنایا گیا تھا۔

قلعہ کی ظاہری ہیئت مستطیل نما ہے۔ ایک بڑا برج جانب جنوب ہے۔ اور چار چھوٹے بڑے برج جانب شمال فصیل کے کنگرے مخروطی شکل کے خاص عربی وضع کے ہیں۔ اب قدیم عمارت میں فقط فصیل اور برج ہی باقی رہ گئے ہیں۔ قلعہ کے پہلے دروازے سے داخل ہونے کے بعد پہلے ایک گلی سی آتی ہے۔ پھر اس کے بعد ایک اور دروازہ آتا ہے جس کے سامنے ایک چھوٹا سا صحن ہے۔ جو کوئی (۵۰) گز عریض اور (۸۰) یا نوے گز طویل ہوگا۔ اس صحن کے جنوبی جانب اب مالک قلعہ ایک نئی مسجد تعمیر کرا رہے ہیں۔ مسجد کی چھت بہت نیچی رکھدی گئی ہے جس سے دیکھنے والے کی نظر میں وہ کچھ بھلی نہیں معلوم ہوتی۔ عمارت کا اندرونی حصہ سنگین بڑے بڑے جلا شدہ پتھروں کا بنایا گیا ہے۔ چھت گنبد نما ہے۔ لیکن دبی ہوئی سی۔ بعض جگہ منبت کاری کی گئی ہے اور نہریئے کا کام ہے۔ سُرخ رنگ بھی استعمال ہوا ہے۔ لیکن باوجود اس تزئین کے عمارت کی شان کچھ کھلی نہیں ہے۔

اس صحن کے بعد جنوبی جانب ہم ایک اور صحن میں داخل ہوتے ہیں جو بہت وسیع ہے۔ یہاں جانب دریا ایک اور عمارت

---

[1] ملاحظہ ہو نفح الطیب حصہ اول صفحہ ۲۹۸۔ مقری نے یہ بھی لکھا ہے کہ الحلة المذہبہ کے گیارہ باب تھے جن میں قرطبہ کے صوبے کے پرگنوں اور قصبات کا ذکر تھا۔ ان میں سے ایک پورا باب المدور پر تھا۔ جس کا عنوان کتاب الوشی المصور فی حلی کورة المدور رکھا گیا تھا۔

نظر آتی ہے۔ جس میں موجودہ طرز کے ملاقات کے ایوان سونے اور پڑھنے کے حجرے اور کھانے کے کمرے ہیں قلعہ کی طرز سے یہ عمارت بالکل بے جوڑ معلوم ہوتی ہے ۔

قلعہ کے اندر سب میں دلچسپ مقامات برج ہیں جنوبی برج سب میں عظیم الشان ہے یہ قلعہ کی فصیل سے ذرا ہٹا کر بنایا گیا ہے فصیل اور برج کے درمیان پل ہے جو نہایت سبک اور مرتفع محراب پر قائم ہے محراب کی شکل بعینہ گلبرگہ کی مسجد کی سدکار کی محراب کی سی ہے۔ قلعہ کی بیرونی ہئیت میں اس برج کے آگے نکلے ہوئے ہونے سے اور محراب کے قیام سے ایک خاص خوشنمائی پیدا ہوگئی ہے۔ برج کی بیرونی ساخت مستطیل ہے۔ طول ۷۰ فٹ اور عرض ۴۰ فٹ۔ اندر تین منزلیں ہیں پہلی منزل میں ایک مربع کمرہ ہے۔ اس کی چھت گنبدی ہے اور آٹھ ضلعوں پر قائم ہے۔ گنبد کے نیچے دیواروں کے کونوں پر محرابیں بنا دی گئی ہیں۔ جس سے آٹھ ضلعے نکل آگئے ہیں۔ دوسری منزل میں جو اس منزل کے نیچے ہے ایک ہشت پہلو ایوان ہے۔ اس کی چھت بھی گنبدی ہے۔ لیکن ڈاٹ نما نہیں ہے بلکہ پھیلی ہوئی ہے۔ تیسری منزل کے کمرے کی بھی یہی شکل ہے۔ یہ کمرہ نہایت تاریک ہے۔ ہوا کے لئے چھت کے قریب نہایت تنگ روزن ہیں۔ غالباً یہ مقام قیدیوں کے لئے ہوگا۔ اس برج کی دیواروں کے آثار بہت چوڑے ہیں۔ اور ان کے استحکام اور مضبوطی میں رومانوی اثر معلوم ہوتا ہے۔ برج کی منزلوں میں تیراندازوں اور توپچیوں کی نشانہ بازی کے لئے مناسب مقامات پر روزن بنے ہوئے ہیں۔

شمالی جانب جو چار برج ہیں ان میں دو فصیل کے دونوں کونوں پر گول ہیں اور باقی دو فصیل کے وسط میں بنے ہوئے ہیں چوکور ہیں۔ ان برجوں کی چنائی میں فی الحال ایک ایک درجہ کھلا ہوا ہے۔ باقی یا تو بند ہوگئے یا بنائے ہی نہیں گئے وسط کے برجوں میں کھڑکیوں کی محرابیں نعل نما ہیں۔ اور نہایت نفیس معلوم ہوتی ہیں۔

قلعہ کا موقع تیس تیس چالیس میل تک کی گرد کی زمین پر دھاوا مارنے کے لئے بہترین ہے۔ اوپر سے وادی کی چیزیں بالکل ہتھیلی میں معلوم ہوتی ہیں۔ قدرتی منظر بھی نہایت دلفریب ہے ۔ وادی الکبیر سفید سانپ کی طرح پیچ وتاب کھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ ہرا بھرا جنگل سرسبز پہاڑیاں عجب بہار دکھاتی ہیں۔ قلعہ کے اوپر چڑھنے کے لئے صرف شہر کی جانب سے راستہ ہے۔ یہ بھی نہایت دشوار گذار ہے اور برجوں کی زد میں ہے باقی تین طرف پہاڑ کی چٹانیں بالکل سیدھی آسمان کو چلی گئیں اور حملہ کا مطلق اندیشہ نہیں ہے ۔ میں قرطبہ سے قلعہ کے دیکھنے کے لئے دو مرتبہ آیا اور سارے سارے دن ٹھیرا چند گھنٹے قلعہ میں ٹھیرتا تھا۔ باقی وقت قصبہ کی آوارہ گردی میں گزرتا تھا۔ بچوں کو کالے رنگ کا انسان تماشہ معلوم ہوتا تھا Moovo! Moovo! مورو! مورو! کہکر پکارتے تھے۔ ان کی آوازوں نے گھر کی عورتیں

(بقیہ صفحہ ۳۹ پر ملاحظہ ہو)

مذاہب عمرانی اور ملت اسلامی

از راغب احسن صاحب ایم۔ اے کلکتہ

ہم اپنے عزیز بھائی جناب راغب احسن صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ایک ایسے مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے جس کی اہمیت مسلم ہے۔ یہ راغب صاحب کے سلسلہ مضامین کی پہلی قسط ہے جسمیں مختلف معاشی مذاہب کی تشریح کی گئی ہے۔ انکا ارادہ ہے کہ آئندہ اقساط میں ان مذاہب کی علمی تحلیل کے ساتھ ان پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کریں مضمون کا تتمہ سیاسی نما۔ ادا کی تعبیر ہوگا۔ ۔ مدیر

حصہ اوّل

(۱) تمہید (۲) جدید مذاہب عمرانی کی تعریف و تصریح، کمیون ازم، انارک ازم، سوشیل ازم، اور سوشیل ریفارم (۳) کیپیٹل ازم کے معنے اور متعلقہ مسائل کی تصریح: سرمایہ اور دولت۔ دو فاضل پیداوار، کا تخیل۔ کوئیزے، میرابو، آدم اسمتھ، ریکارڈو، مارشل اور مارکس۔ مروجہ لگان، اور معاشی لگان۔ محنت اور سرمایہ، نفع اور سود، مشین اور انسان، سائنس اور سرمایہ دار۔ (۴) بیسویں صدی کا دوسرا صنعتی انقلاب اور اس کی خصوصیات: اجارہ داری اور سرمایہ داری کا اتحاد۔ صنعتی انصرام اور صنعتی مالیات کی تفریق، رشنیل آئی زیشن، فسطائیت، اسٹیٹ اور سرمایہ داری، بہتات اور افلاس، ملکیت کی نوعیت میں انقلاب۔ شخصیات: ملکیت پرستی۔ طاقت پرستی۔ بے غرضانہ خدمت اور للہیت۔

تمہید

اس مضمون کی شان تحریر بذات خود دلچسپ اور اہم ہے۔ ۲۸، جولائی ۱۹۳۵ء کو دلکشا پٹنہ میں، آنریبل سید عبدالعزیز صاحب وزیر تعلیم و صنعت حکومت بہار کی دعوت پر صوبہ بہار کے عمائد اسلام کا ایک خاص اجتماع اردو زبان کی حفاظت، تعلیم نسواں کی ترقی اور مسلمانوں کی آئندہ سیاسی تنظیم کے مسائل پر مذاکرہ کے لئے منعقد ہوا۔ اس مجلس شوریٰ کے سامنے سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے آنے والے دستور جدید کے ماتحت مسلمانوں کی سیاسی پارٹی بندی کن اصول کے مطابق ہونی چاہئے۔ مجلس میں ہر چند مسلم لیڈروں نے

کامل سیلف گورنمنٹ - چودہ نکات اور کمیونل ایوارڈ کو بطور سیاسی اصول اساسی پیش کیا لیکن ایک خاص طبقہ سے کرنیڈ، نصب العین اور مسلک کی مزید تعریف و تصریح کا مطالبہ جاری رہا۔ اس مجلس کے تمام ارکان مذکورہ تین اصول پر اتحاد رائے رکھتے تھے۔ لیکن ان سے ایک چھوٹی سی جماعت ان کو سیاسی پارٹی بندی کے لئے کافی نہیں جانتی تھی ان کو ان اصول کے اندر کسی بڑی چیز کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔

اس مذاکرہ کی بحث و نظر سے مجھے صاف طور سے محسوس ہوا کہ اب غالباً فرقہ دار سیاسیات کے غلبہ کا دور ختم ہو رہا ہے اور ذمہ دارانہ عملی سیاسیات اور عملی و نظری معاشیات کی سرحدیں باہم مل رہی ہیں۔ ان کا باہم ملنا اٹل اور مقدر ہے۔ لوگوں کے ذہنوں میں اب کیپٹل ازم اور سوشلزم کے بنیادی حقائق اور مسائل زیادہ صاف اور متعین ہوتے جا رہے ہیں۔ "کلاس وار،، (طبقاتی جنگ) اور "کلاس کانشنس،، (طبقاتی شعور و احساس) بڑھتا جاتا ہے۔ اندریں حالات اب محض پرانی لکیر کے فقیر بنے رہنا کافی نہیں ہے۔ جدید حالات کا مطالبہ ہے کہ مفکرین ملت مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے سامنے عملی و نظری لحاظ سے ایک معقول، مفصل اور مناسب عمرانی نصب العین اور لائحہ عمل پیش کریں۔ اور اس کو ان کے ملی مزاج اور دینی روایات سے پیوند دیں۔

اس احساس کے زیر اثر میں نے مجلس شوریٰ سے واپس آکر، اسی رات کو ایک مضمون بعنوان "مسلمانوں کی سیاسی تنظیم اور اس کا نصب العین،، لکھا جو اتحاد پٹنہ مورخہ ۴ ؍ اگست میں شائع ہوا اور عام طور سے پسند کیا گیا لیکن اس کے بعض خیالات سے چند دوستوں کو غلط فہمی ہوئی کہ ان کو تعجب ہے کہ میں نے ایک ہی سانس میں "اشتراکیت اور سرمایہ داری،، دونوں کی مخالفت کی ہے، اول الذکر کو بے روح مادیت پرستی پر مبنی قرار دیا ہے اور ثانی الذکر کو "شیطانی آزادی،، کا اہرمن ظاہر کیا ہے۔ میں آج کی صحبت میں اپنے مطلب کی توضیح کروں گا۔ اس مقصد کے لئے یہ ضروری ہے کہ سب سے اول خاص عمرانی مذاہب کی تعریف پیش کی جائے تاکہ یہ معلوم اور متعین ہو جائے کہ ہم دراصل کن امور کے متعلق جدید بحث کر رہے ہیں۔ ان کی کیا نوعیت و حقیقت اور مقصد و منہاج ہے اور ان میں کیا باہمی فرق اور تعلق ہے۔

۲۔ جدید مذاہب عمرانی کی تعریف و تصریح

میں نے مضمون مطبوعہ اتحاد پٹنہ میں جس چیز کی مخالفت کی ہے وہ مادیت پرست کمیونزم ہے نہ کہ سوشلزم۔ معاشئین پر یہ بخوبی روشن ہے کہ کمیونزم، سوشلزم اور سوشل ریفارم، تینوں میں بہت بڑا

اور بنیادی فرق ہے اور اس کا جاننا معاشی مسلک پر صحیح فکر کے لئے ضروری ہے۔ یہ محل ان مختلف مذاہب کی فنی اور دقیق تعریف کا نہیں ہے ابتدا میں ان کے اصلی معنی کو سلیس سے سلیس اور کم سے کم الفاظ میں پیش کروں گا۔

کمیون ازم کے معنی ۔ کمیون ازم وہ معاشی مذہب ہے جو تمام املاک اور عوامل پیدائش (زمین، محنت، سرمایہ اور تنظیم) کے اشتراک کا حامی ہے۔ اس کا طریقۂ عمل انقلابی ہے۔ وہ ذاتی ملکیت کے کلی انعدام اور خاندان کی اجتماعی معمولیت کا موید ہے۔ وہ تاریخ کی مادی تفسیر کرتا ہے اور ہر عنصر تمدن کو مادی حالات اور معاشی عوامل کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔

معاشی مساوات اور سوشیل محرکات اشتراکیت کے بنیادی عقائد میں سے ایک اہم عقیدہ، تمام افراد جماعت کی انفرادی آمدنیوں میں کامل مساوات پیدا کرنا ہے۔ اس کے خیال میں تمام دماغی اور جسمانی محنت کرنے والوں کو یکساں اجرت (خواہ بصورت زر یا جنس) ملنا چاہئے۔ اس عقیدہ کی بنیاد اشتراکیت کے اس اصل عظیم پر ہے کہ تمام انسانوں کی حیوانی ضروریات، اور معاشی مطالبات یکساں ہیں۔ سب رہائش، خورش، پوشش کے تین ابتدائی حوائج کے یکساں طور پر طالب ہیں۔ کفاف حیات کے معاملہ کو جارج برنارڈ شا نے اتنی اہمیت دی ہے کہ اس کے خیال میں جو اشتراکیت آمدنی کی مساوات کو تسلیم نہیں کرتی اشتراکیت کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ اشتراکیت کا دعویٰ یہ ہے کہ ذاتی نفع اندوزی کا خیال اور معاشی امتیاز و برتری کے حصول کی خواہش وہ تنہا محرکات نہیں ہیں جن پر انسانی ترقی کا دار و مدار ہے بلکہ افراد انسانی کے دماغ اور قلب کے اندر بہت سے ایسے دوسرے سوشیل موثرات اور اخلاقی محرکات کے سوتے مستور ہیں جن کی طاقت سے ایجاد و ترقی کی راہ میں وہ کام لیا جا سکتا ہے جو اس وقت محض سفلی جذبات اور نفسانی خواہشات پر منحصر تصور کیا جاتا ہے۔ اشتراکیت خود غرضانہ نفع اندوزی کی جگہ اسی اجتماعی اور اخلاقی حس کو پیدا کرنا چاہتی ہے۔

اشتراکیت اور ریاست اسٹیٹ (سلطنت) کے متعلق کمیون ازم کا یہ خیال ہے کہ یہ کوئی مستقل اور ضروری سوشیل ادارہ نہیں ہے۔ اجتماعیات انسانی سے سلطنت کا کوئی لازمی و ابدی تعلق نہیں ہے۔ اسٹیٹ درحقیقت محض برسر اقتدار طبقات کی مجلس تنفیذی اور قوت قاہرہ کا نام ہے۔ چنانچہ معاشی حالات اور طبقات تغیرات کے ساتھ، سلطنت کی شکل بدلتی رہتی ہے۔ اشتراکیت کا نصب العین معاشی مساوات پیدا کرنا، اور کلاسوں اور طبقوں کی تفریقات کو جڑ اور بنیاد سے مٹانا ہے پس یہ ضروری اور لابدی ہے کہ کلاس سوسائٹی (طبقاتی جماعت) کے خاتمہ کے ساتھ سلطنت خود بخود ختم ہو جائے گی۔

معاشاً اشتراکیت کا نصب العین طبقات کی تفریقات کو مٹانا اور افراد کی آمدنی میں مساوات پیدا کرنا

اور سیاسی انجام کار سلطنت کے جابرانہ نظام سے انسانوں کو نجات دینا ہے۔

یہاں یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کیمون ازم کا آئیڈیل سیاسی حکومت، کو مٹانا ہے نہ کہ معاشی نظم و نسق،، اور سوشیل ادارات کو ختم کرنا۔ پولٹیکل ادارات کی اساس جبر پر ہے، سوشیل ادارات رضا کارانہ تعاون پر مبنی ہیں۔ اشتراکیت کے قیام و تکمیل پر۔ گورنمنٹ فنا ہو جائیگی لیکن سوشیل ایڈمنسٹریشن (عمرانی نظم و نسق) باقی رہے گا بلکہ اپنے دائرہ، وظیفہ، اور اہمیت میں بہت زیادہ ترقی کرے گا۔ البتہ اُس کی اساس آزادانہ تعاون باہمی پر ہوگی۔

اشتراکیت اور آمریت کیمون ازم، انقلاب، تشدد، اور دہشت انگیزی کی راہ سے، سلطنت و حکومت پر قابض ہو کر اُس کی طاقت کو سرمایہ داری اور کلاس سوسائٹی کے انہدام کے لئے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ بنابریں کیمون ازم کے عقاید میں سے ایک بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ کلاس سوسائٹی آناً فاناً اشتراکی سوسائٹی نہیں بن سکتی ہے اس کی تعمیر و تخلیق ایک طویل زمانہ کی طالب ہے۔ لہذا اشتراکیت ایک درمیانی زمانہ انتقال کے لئے اسٹیٹ کی ضرورت تسلیم کرتی ہے۔ یہ درمیانی زمانہ انتقال، کارل مارکس کے الفاظ میں، طبقہ اہل محنت کی آمریت۔ (ڈکٹیٹر شپ آف دی پرولی ٹیریٹ) ۔ کا دور ہوگا۔ اس دور میں بتدریج سرمایہ داری کے نشانات مٹائے جائیں گے اور اس کی جگہ کیمون ازم کے سوشیل ادارات کا قلم لگایا جائیگا۔ اس دور کی کامیابی کی کسوٹی کلاس سوسائٹی اور اسٹیٹ کا خاتمہ اور حقیقی اشتراکی سوسائٹی کی پیدائش ہے۔ اشتراکیت اپنے عارضی دور آمریت میں ایسے حالات پیدا کرنا چاہتی ہے کہ نہ معاشی طبقات کی تفریق باقی رہے اور نہ اس تفریق کے قائم و دائم رکھنے کا سیاسی آلہ —— سلطنت —— باقی و برقرار رہے۔

انارک ازم کے معنیٰ انارک ازم (نراج) کا مذہب بھی کیمون ازم کی طرح انقلاب اور تشدد کے طریقہ کار پر ایمان رکھتا ہے لیکن ان دونوں مذاہب میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اشتراکیت اصلاً ایک معاشی مذہب اور انارک ازم سیاسی فلسفہ ہے جو ہر طرح کی سیاست اور جبر کو خالص غیر ضروری و مضر یقین کرتا ہے۔ نراج کے عقیدہ میں تمام انسانی مفاسد کا سرچشمہ تمام برائیوں کی جڑ اور تمام خرابیوں کا اصل جبر و قہر ہے۔ اسٹیٹ اس لحاظ سے "شر اعظم" ہے کیونکہ اس کی زندگی بنیادی جبر و سیاست کے نظام پر ہے۔ قانون اسٹیٹ کا آرگن ہے اور قانون کی پشت پر عقوبات و تعزیرات کا تازیانہ ہے۔ پولیس فوج اور جیل کی قہرمانیت ہے۔

نراج کا عقیدہ ہے کہ انسان فطرتاً نیک اور غیر محدود ترقیات کے لائق ہے۔ اگر اس کی راہ سے جبر و ظلم کے تمام موانع دور کر دیئے جائیں اور آزادانہ تہذیب نفس کا موقع بہم پہنچایا جائے تو وہ فرشتوں سے بھی زیادہ

بہتر زندگی بسر کر سکتا ہے۔ نراج، فردی تکمیل نفس اور تہذیب اخلاق کا حامی اور سوسائٹی کی عادلانہ تنظیم کا داعی ہے۔ وہ جبر و قہر کے ہر نظام کو انسان کے اخلاقی اور روحانی شخصیت کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ جانتا ہے اس لئے ان کا مٹانا، اس کا پہلا فرض ہے۔

یہاں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ نراج، اخلاق و مذہب۔ اور سوسائٹی کے حدود اور عوائید — حقوق اور فرائض — کا مخالف نہیں ہے۔ اس کے خیال میں، اگر فرد کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور صرف اُن کی اخلاقی تعلیم و تربیت اور عادلانہ سوشیل تنظیم پر زور دیا جائے تو وہ ایک نیک، پُرامن اور اخلاقی زندگی گذارنے کی سب سے زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک دوسری عام غلط فہمی یہ ہے کہ نراج ہر طرح کی امامت و سیاست کا مخالف ہے لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ نراج ہر اُس حکومت کا مخالف ہے جو خارج کے عائد کردہ جبر اور سیاست پر مبنی ہو۔ لیکن وہ ایسی "رضا کارانہ حکومت" اور جمہوری قیادت کی ضرورت کا قائل ہے جو کوآپریٹو سوسائٹی کے اصول پر مبنی ہو۔

کمیون ازم کا رُخ اجتماعیت کی طرف ہے اور انارکی ازم کی بنیاد انفرادیت پر ہے۔ لیکن یہ سمجھنا کہ نراج سوشیل تنظیم اور سیادت کی تمام شکلوں کا مخالف ہے صحیح نہیں ہے۔ نراج کا عقیدہ یہ ہے کہ آزادی اور امداد باہمی وہ دو بہترین طریقے ہیں جن کے ذریعہ تمام، انفرادی اور اجتماعی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں۔

سوشیل ازم کے معنی۔ سوشیل ازم (اجتماعیت) کے، اگرچہ کئی مسالک ہیں۔ اور اُن میں نظریہ اور طریقہ کے کئی اہم اختلافات ہیں۔ لیکن جہاں تک اُن کے نصب العین اصلی اور مقدمات اساسی کا واسطہ ہے، وہ چند بنیادی اصول پر متفق ہیں۔ سوشیل ازم، موجودہ سرمایہ داری کی تنقید، آئندہ سوشیل ترقی کے فلسفہ، ایک تھیوری، ایک عملی پروگرام اور ایک سیاسی تحریک کے عناصر سے مرکب ہے۔ ہمیں یہاں زیادہ تر اس کی تھیوری سے بحث ہے، جہاں تک نظریہ کا تعلق ہے۔ اکثر مسالک اجتماعیت، ان اصول پر متحد ہیں کہ (۱)، زمین اور (۲) صنعتی سرمایہ کے دو بنیادی آلاتِ پیدائش کو ساری سوسائٹی کی ملکیت قرار دی جائے اور تمام بڑی بڑی قومی صنعتوں کو رفاہ عامہ کی غرض و غایت کے ساتھ قومی نگرانی کے ماتحت چلایا جائے۔ سوشیل ازم سرمایہ داری کے اصول مسابقت اور معاشی آزادی کی سخت تنقید کرتا ہے۔ اور اس کو نہ صرف کمزوروں اور ناداروں کے حق میں ظالمانہ اور مفسدانہ جانتا ہے بلکہ معاشی اختلال و بحران اور سوشیل انارکی و بدنظمی کا بھی بنیادی باعث گردانتا ہے۔ سرمایہ داری کی انفرادی آزادی کے غلو کی جگہ وہ تمام ایسے صنائع میں جن کا تعلق رفاہ عا

سے ہے اور جو اجارہ اور شخصی تغلب واحتکار کے خطرات میں آسانی سے پڑ سکتے ہیں جماعتی نگرانی اور دولتی پلاننگ کو ضروری تصور کرتا ہے۔ اجتماعیت طلب و رسد کے قوانین کی غیر محدود آزادی کو جماعتی فلاح کا ضامن نہیں مانتی ہے بلکہ قومی منصوبیت اور جماعتی تنظیم کو ضروری جانتی ہے۔

یہ ایک دوسرا سوال ہے کہ قومی صنائع کا انصرام واہتمام براہ راست حکومت کرے یا اُس کی ماتحت ادارت ومجالس کے ذمہ یہ کام ہو۔ برطانوی اجتماعیت، علی الخصوص فےبی این سوشیل ازم، گیلڈ سوشیل ازم اور سڈنی ویب نے واضح کیا ہے کہ قومی صنعتوں کے نظم ونسق کے لئے تنہا مرکزی حکومت کی دفتریت پر بھروسہ کرنا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ عملی طریقہ یہ ہے کہ بجز چند نہایت اہم اور عمومی صنائع وخدمات کے باقی تمام صنعتوں کے ماتحت مجالس، گیلڈز، سوسائٹیوں، میونسی پلیٹیوں اور خاص بورڈوں کے حوالہ کر دینا چاہئے اور ان خاص مجالس کو انتظام وانصرام کے معاملات میں بہت زیادہ داخلی آزادی وخودمختاری حاصل ہونا چاہئے۔

اسی طریقہ کا مقصود یہ ہے کہ صنعتوں کی تنظیم وترقی میں سیاسی اور دفتری اثر زیادہ غلبہ حاصل نہ کرے اور ساتھ ہی اُن کی عمومی پالیسی اور غایت فلاحِ عام کے اصول کے خلاف نہ ہو۔

سوشیل ازم کے بنیادی عقائد میں سے ایک اہم ترین عقیدہ یہ ہے کہ تمام دَولت، قدر، اور پیدائش کا اصل الاصول محنت ہے۔ محنت کے سوا اور کوئی چیز حقیقی معنی میں عاملِ پیدائش قرار نہیں دی جا سکتی ہے۔ زمین اور تمام عطیات قدرت محنت کے بغیر بے کار ہیں۔ جس کو سرمایہ کہا جاتا ہے وہ کوئی مستقل اور زندہ عاملِ پیدائش نہیں ہے بلکہ محض سابقہ محنتوں اور کاوشوں کی مجسم ومتشکل صورت ہے جس کو تنظیم آرگے نائزیشن Organisation کہا جاتا ہے وہ بھی محنت کی ایک قسم ہے زیادہ سے زیادہ اسکو ہم اعلیٰ درجہ کی دماغی محنت کہہ سکتے ہیں

سوشیل ازم اور کمیون ازم اس عقیدہ میں اس حد تک متفق ہیں لیکن سوشیل ازم کمیون ازم سے اس بات میں مختلف ہے کہ وہ جسمانی محنت اور دماغی محنت، معمولی کارکردگی اور اعلیٰ کمیاب تنظیمی صلاحیت کے فرق وامتیاز کو اصولاً مانتا ہے۔

سوشیل ازم اور کمیون ازم کا فرق سوشیل ازم اور کمیون ازم میں جہاں تھیوری آف ویلیو (نظریہ قدر) کے متعلق بہت حد تک اتفاق ہے، وہ کئی بنیادی اصول میں ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔

(۱) کمیون ازم تاریخ کی مادی تفسیر کرتا ہے سوشیل ازم مادی اور معاشی معاملات کی جماعتی اصلاح پر زور دیتا ہے لیکن تاریخ کی مادی تفسیر اُس کے مذہب کا کوئی ضروری عقیدہ نہیں ہے۔

(۲) کیمون ازم عملاً تمام مذاہب و ادیان کا مخالف ہے اور اُن کو سرمایہ داری، رجعت پسندی اور قدامت پرستی کا حصّا آخرین قرار دیتا ہے۔ سوشیل ازم کی تھیوری اور پروگرام کو لازماً کسی مذہب سے واسطہ نہیں ہے۔ اجتماعیت بخلاف اشتراکیت محض ایک خاص معاشی خیال اور اقتصادی پروگرام ہے۔ اور بس۔ سوسائٹی کی معاشی اصلاح سے زیادہ اور کچھ وہ نہیں چاہتی ہے۔

(۳) کمیون ازم، اسٹیٹ کو ایک ضروری برائی کی حیثیت سے محض زمانہ انتقال کے لئے عارضی طور پر تسلیم کرتا ہے اس کا آخری نصب العین یہ ہے کہ سلطنت اشتراک کے قیام کے بعد فنا ہو جائے۔ سوشیل ازم کے تمام اسکول کم و بیش اسٹیٹ اور جمہوریت کو تسلیم کرتے ہیں اور اُن کے سیاسی ادارات پر قبضہ کر کے قانون سازی کے طریقہ کے ذریعہ سوشیل ازم کے اصول کو جاری کرنا چاہتے ہیں۔

(۴) آمریت (ڈکٹیٹرشپ) کیمون ازم کے عقائد میں داخل ہے۔ اشتراکیت زمانہ انتقال کی حکومت کو کلیتاً اہل محنت طبقہ کے ہاتھ میں دینا چاہتی ہے۔ سوشیل ازم عام جمہوری فرنچائیز کو مانتا ہے اور آمریت کو اپنے مقاصد کے لئے غیر ضروری جانتا ہے۔

(۵) کمیون ازم نہ صرف "زمین" (عطیات قدرت) اور "سرمایہ" بلکہ ہر طرح کے املاک ذاتی کو قومی قرار دیتا ہے۔ اشتراکیت شخصی ملکیت کو کلیتاً نیست و نابود کرنا چاہتی ہے۔ اجتماعیت (سوشیل ازم) شخصی ملکیت کو مانتی ہے۔ وہ ذاتی استعمال کے اجناس، سکونتی مکانات، اور خود کاشتہ اراضی کے حق مقابضت کو اجتماعی قیود کے ماتحت افراد کے ہاتھ میں چھوڑ دینا چاہتی ہے۔ سوشیل ازم "زمین، صنعتی سرمایہ، اور تنظیم" کے تین اہم آلات پیدائش کی نگرانی، کے سوا شخصی ملکیت شخصی آمدنی — اور شخصی آزادی — کو چند حدود و شرائط کے اندر ماننے کو تیار رہے۔

(۶) کیمون ازم، (اشتراکیت) فسطائیت کی طرح اصول "کلیت (Totalitarianism) پر ایمان رکھتا ہے اور زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی، دینی و اخلاقی شعبوں پر حاوی اور مسلط ہونا چاہتا ہے۔ سوشیل ازم کو اصولاً دین و مذہب، اخلاق اور خاندان کے معاملات سے کم تعلق ہے۔ سوشیل ازم پیدائش دولت اور تقسیم دولت کے معاشی معاملات کے اندر عدالت و مساوات پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ اگر سرمایہ داری کی معاشی ناہمواریوں کو دور کر دیا جائے اور افراد و مجالس کو مناسب آزادی دیدی جائے تو پھر دوسری خرابیاں خود بخود رفع ہو سکتی ہیں اور شہری اپنی اصلاح آپ کر سکتے ہیں۔ بالفاظ دیگر لاسافیر (سلطنت کی عدم مداخلت) کے

اصول کا انکار اور جماعتی نگرانی کی حمایت کرنا ہے۔ باقی معاملات میں وہ آزادی کی راہ کا مخالف نہیں ہے۔

(۷) کمیونزم، نراج کی طرح طریقۂ انقلاب کا حامی ہے۔ سوشیل ازم طریقۂ ارتقاء کا داعی ہے۔ کمیونزم بذریعہ تشدد اور جنگ سرمایہ داری کو جبراً بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ سوشیل ازم اصول تدریج کو مانتا ہے اس لئے وہ اسٹیٹ پر جمہوری ذرائع سے قابض ہو کر بذریعہ قانون سازی اجتماعی اصلاحات رفتہ رفتہ جاری کرنا چاہتا ہے سوشیل ازم نظم و انصرام کے مشکلات کا احساس رکھتا ہے اور موجودہ قومی ادارات کو ان مشکلات پر قابو پانے کیلئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ انگلستان کی جدید سیاسی تاریخ سے واضح ہے کہ کم سے کم برطانوی اجتماعیت جو اس مذہب کا سب سے زیادہ عملی اور معتدل اسکول ہے شاہیت کے ادارات کو بھی اپنے معاشی مقاصد کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں جانتی ہے۔ بلکہ تاج کی شخصیت، نام اور منصب کو قوم کی نمائندہ شخصیت، نام، اور منصب کی حیثیت سے سوسائٹی کی فلاح عامہ کے لئے استعمال کرنا چاہتی ہے۔

سوشیل ریفارم اور صنعتی انقلاب سوشیل ریفارم صنعتی انقلاب (انڈسٹریل ریولیوشن) اور لاسافیر یعنی لامحدود معاشی آزادی اور سرمایہ داری کے ابتدائی مفاسد و مظالم کی جمہوری طریق سے اصلاح کا پروگرام ہے۔ صنعتی انقلاب سے، وہ سوشیل اور ٹیکنیکل تغیرات مراد ہیں جو اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں مغربی یورپ میں نمودار ہوئے اور جنھوں نے دنیا نے صنعت و حرفت اور تجارت کو بالکل منقلب کر دیا۔ اس انقلاب کے پہلے امریکہ کی نئی دنیا اور ہندوستان کی نئی تجارتی راہ دریافت ہو چکی تھی۔ اس کے عقب پر اسٹیم پاور، بجلی، اور مشین کی تسخیر عمل میں آئی۔ بجائے دستی اوزار کے اسٹیم اور بجلی سے چلنے والی بڑی بڑی مشینوں کی ایجاد ہونے لگی۔ صنعت و حرفت، چھوٹے چھوٹے دیہاتی گھروں سے نکل کر بڑے بڑے شہروں اور معدنی مرکزوں میں مجتمع ہو گئی۔ چھوٹی کارگاہوں کی جگہ بڑے بڑے کارخانوں نے لے لی۔ آزاد کاریگر جو اپنے گھر میں کام کرتا تھا فنا ہو گیا اور اس کی جگہ ایسے مزدوروں کی فوج نے لے لی جو دائرا دیکھے نہ اپنے اوزار اور پیداوار کے مالک تھے۔ ان مزدوروں کے پاس نہ شہروں میں اپنی زمین تھی اور نہ اپنا مکان نہ اپنی کارگاہ تھی اور نہ کوئی ملکیت۔ وہ فی نفسہ خود ایک جنس تجارت بن گئے تھے اور لیبر مارکیٹ میں اپنی محنت بیچتے تھے کیونکہ دراصل ان اجرتی غلاموں کے پاس رومی غلاموں کی طرح بجز ان کی محنت کے اور کوئی چیز اپنی تھی ہی نہیں۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ صنعتی انقلاب نے جسمانی محنت کی مدد پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے دریافت کردہ قوانے فطرت کو لگا دیا۔ اور "پیدائش بہ پیمانہ صغیر" کی جگہ "پیدائش بہ پیمانہ کبیر" نے لے لی ضلع وار اور صوبہ دار ملکی مارکیٹ بین الاقوامی اور عالمگیر مارکیٹ بن گئی۔

سوشل نتیجہ اس اہم ترین صنعتی انقلاب کا یہ ہوا کہ تھی بھر سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کے ہاتھوں میں ملک کی صنعت و حرفت آگئی اور لاکھوں کروڑوں اہل محنت مزدور، اپنی زندگی کے لئے اُن کے رحم و کرم پر منحصر و موقوف ہوگئے اس کمزوری اور بے بسی سے ہولناک مظالم اور مفاسد پیدا ہوئے۔ کام کے اوقات بہت زیادہ طویل تھے۔ کارخانوں اور کارگاہوں کی حالت نہایت تکلیف دہ اور مضر صحت تھی۔ اُجرت اور مزدوری کی مقدار آئرن لا آف ویج (Iron law of Wage) کے ماتحت بمشکل قوت لایموت کے لئے پورا ہوتی تھی۔ عورتوں اور بچوں کی کمزوری اور بے بسی کی حالت سے ناجائز فائدہ اُٹھاکر اُن کو ایسے مضر صحت حالات میں اور اتنے عرصہ تک رات دن گھٹایا جاتا تھا۔ کہ اُن کی زندگی موت سے بدتر ہوگئی تھی اور اُن کی شرح اموات نہایت ہولناک درجہ تک پہونچ گئی۔

صنعتی انقلاب کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوا کہ گاؤں اُجڑ گئے اور شہروں اور معدنی مرکزوں میں ایک نئی قسم کی صنعتی آبادی پیدا ہوگئی۔ ملک کی آبادی دیہات سے شہروں کی طرف مرکوز ہونے لگی۔ ان نئے صنعتی شہروں میں کارخانہ دار اپنی مخصوص مجالس میں نہایت مضبوطی سے منظم و متحد ہوگئے، برعکس ازیں، مزدوروں کا نہ اپنا کوئی مکان تھا اور نہ اپنی کوئی زمین تھی، اُن کے لئے باہمی اتحاد اور یونین قائم کرنا بھی خلاف قانون بنا دیا گیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ کارخانہ دار باہم مل کر اور ایک زبان ہوکر معاملہ کرتے تھے اور غیر منظم مزدوروں کو اپنی جنس تجارت یعنی محنت کی اُجرت کے تعین میں کوئی اختیار حاصل نہیں تھا۔ وہ غریب پوری طرح سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر تھے کیونکہ وہ انفرادی حیثیت سے معاملہ کرتے تھے اور اپنی ناداری کے سبب انتظار کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ اگر ایک مالک کسی مزدور کو علیحدہ کردے تو پھر اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ تمام کارخانہ دار اُس کو نکال دیتے ہیں اور وہ بیچارہ بے موت مر جاتا ہے۔ سب سے بڑی خرابی سرمایہ داری کی لامحدود آزادی کی یہ ہے کہ مزدوروں کی زندگی کی ساری آزادی ختم ہو چکی ہے۔ وہ ایک جنس تجارت بن گئے ہیں۔ اور اس کی بھی پوری قیمت اُن کو نہیں ملتی ہے وہ صحیح معنوں میں غلام بن گئے ہیں۔ اور اِن اُجرتی غلاموں کی غلامی از منہ وسطیٰ کے سرف (یعنی زرعی غلاموں) کی غلامی سے بہتر نہیں ہے۔

سرمایہ داری کے نظری اساسات: سرمایہ داری کی اس خرابی کی بنیاد، منچسٹر اسکول آف ایکونامکس (سرمایہ دارانہ معاشیات، لاسافیر کے عقیدہ، ڈاروین کی جہد اور بقائے اصلح کی حیوانی تعلیم۔ انفرادیت کے مذہب اور بنتھم کے فلسفۂ افادیت (Utilitarianism) نے مہیا کی تھی۔ پہلے سرمایہ داری ظاہر ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کا فلسفہ تراشا گیا تھا۔ ان تمام مؤثرات کا مجموعی اثر سرمایہ داری کے جدید نظام کی تائید اور لامحدود

حیوانی آزادی کی تقویت میں ظاہر ہوا۔ لامحدود اور غیر مشروط آزادی کے عملی معنی جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ سرمایہ داروں کو غیر مقید آزادی کا حق دینا تمام دوسری جماعتوں کو آزادی کے حقوق سے محروم کرنا ہے۔ دراصل آزادیٔ مطلق کا اصول تمام اصول اخلاق کی نفی ہے۔

سوشیل ریفارم کا پروگرام سوشیل ریفارم سرمایہ داری کی اسی ابتدائی خرابی کی اصلاح کا پارلیمنٹری پروگرام ہے۔ رفتہ رفتہ جب سرمایہ داری کے انسانیت کش مفاسد کا احساس قوم میں عام ہوا اور مزدوروں کی تحریک تنظیم نے طاقت حاصل کی تو لاسافیر یعنی معاشی معاملات میں حکومت کی عدم مداخلت کا اصول ترک کیا گیا اور مطابق ذیل طریقوں سے اصلاح حال کی کوششیں بذریعہ قانون کی گئیں۔

(۱) کام کے اوقات کی تحدید اور رخصت کے اوقات کی توفیر۔ (۲) فیکٹری لاز کے ذریعہ کارخانوں کے صحی حالات کی اصلاح۔ (۳) اُجرت اور مزدوری کی شرح میں ترقی۔ (۴) اولڈ ایج پنشن، دسن رسیدگی کا وظیفہ) پروویڈنٹ فنڈ اور ورک مین کمپنسیشن (Workmen Compensation) یعنی مزدوروں کے لئے بصورت نقصان جسم و جان تلافی مافات کے قواعد۔ اور دوسرے سوشیل انشورنس کے طریقوں سے مصائب اور بے اطمینانی کی تقلیل (۵) عورتوں اور بچوں کے کام کی عمر، اُجرت اور حالت کی قانونی حدبندی اور انسپکٹروں کے ذریعہ کارخانوں کی نگرانی (۶) ٹریڈ یونین ایکٹ کے ذریعہ مزدوروں کی انجمنوں کا قانوناً تسلیم کرنا (۷) جماعتی حیثیت سے کارخانہ داروں کی جماعت سے اُجرت، کام اور رعایات کے معاملات کا طے کرنا (۸) جبری ابتدائی تعلیم تفریح گاہ لائبریری، شفاخانہ، زچہ خانہ وغیرہ کا خاص مزدوروں کے لئے اجرا (۹) جبری ابتدائی تعلیم کی حد عمر میں ترقی اور سن رسیدگی کی پنشن کی حد عمر میں بذریعۂ قانون تقلیل۔ (۱۰) کارخانوں کے نفع میں مزدوروں کا حصہ مقرر کرنا (۱۱) لاک آوٹ (Lock out) یعنی مزدوروں کی ایک جماعت پر سرمایہ داروں کی طرف سے انتقاماً تمام کارخانوں کا دروازہ بند کر دینا اور ہڑتال یعنی کسی کارخانے کا مزدوروں کی طرف سے بائیکاٹ کر دینا دو حربے ہیں جن سے محنت اور سرمایہ مسلح ہیں سلطنت نے لاک آوٹ کے اختیار پر پابندیاں عاید کر دی ہیں (۱۲) پرخاسگی کے اختیار کی حدبندی (۱۳) لینڈلارڈز (مالکان زمین و مکان) کے حقوق ملکیت کی تحدید اور رعیت بی المرضی کی جگہ مستقل کاشتکاروں کے حقوق مقابضت کا قانوناً تسلیم کرنا، زمیندار کے اختیارات بے دخلی کے دائرہ کو کم کرنا اور اضافی لگان کی شرائط کی قانونی تعریف کرنا (۱۴) ساہوکاروں اور سود خواروں کے کاروبار، حساب کتاب، شرح سود، اور مکفولات کی قانونی حدبندی اور بے بس ناداروں کی حفاظت (۱۵) پبلک ورکس (تعمیرات عامہ) کے ذریعہ دولت قومی کی ترقی اور بے روزگاری کا علاج (۱۶) گندے، گنجان اور مضر صحت، صنعتی محلوں اور مزدوروں کی آبادیوں کا

صاف کرنا۔ اور اُن کی جگہ مزدوروں کے لئے صاف اور صحت بخش عمدہ مکانات کا بنانا۔ وغیرہ وغیرہ

سوشیل ازم اور سوشیل ریفارم کا اتحاد و اختلاف سوشیل ازم اور سوشیل ریفارم کے درمیان نقطہ اتحاد اور نقطہ اختلاف دونوں موجود ہیں۔ نقطہ اتحاد یہ ہے کہ یہ ہر دو طریقے، لاسافیر اور سرمایہ داری کی خرابی کو تسلیم کرتے ہیں۔ معاشی آزادی کو قومی مصلحت کا تنہا معیار ماننے سے منکر ہیں اور کم وبیش اجماعی ضبط وپابندی (Social Control) اور دولتی نگرانی کو ملک کی ہموار ترقی کے لئے ضروری جانتے ہیں۔ تاہم ان دونوں میں بنیادی اور اہم فرق ہے۔ بعض صاحبوں نے سوشیل ریفارم کو سوشیل ازم سے ملا کر خلط مبحث کیا ہے۔ لیکن سوشیل ریفارم کو سوشیل ازم سمجھنا بالکل غلط ہے۔ بلاشبہ جرمنی کی ابتدائی اسٹیٹ سوشیل ازم کے اسکول نے سوشیل ریفارم کے مذکورہ پروگرام کے بہت سے اجزا پر زور دیا تھا لیکن معاشیین کے نزدیک ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے اور ضرور ہے کہ اس کو نظر انداز نہیں کیا جائے تاکہ علمی بحث اس پر کی جاسکے۔

سوشیل ازم اور سوشیل ریفارم کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ اجتماعیت کیپٹل ازم کو کلیتاً مٹانے کا مقصد رکھتی ہے اور اُس کو جڑ اور بنیاد سے اکھاڑنے کے لئے زمین (یعنی قدرت کو مفت اور آزاد عطیات مثل معدنیات، ہوا، پانی، روشنی وغیرہ جو تمام انسانوں کے لئے فاطر فطرت نے بلا محنت و معاوضے کے مہیا کیا ہے) صنعتی سرمایہ اور اہم قومی صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دیتی ہے۔ برعکس ازیں سوشیل ریفارم گو لاسافیر (کامل معاشی آزادی) کا منکر ہے لیکن دسرمایہ داری کے نظام کو بحال و برقرار رکھتے ہوئے اُس کی نمایاں خرابیوں کو بذریعہ قانونی اصلاحات دور یا نرم کرنا چاہتا ہے۔ سوشیل ازم، معاشی مسائل کے اصول ہی بحث کرتا ہے اس کا تخیل بین الاقوامی بلکہ عالمگیر ہے۔ سوشیل ریفارم کو معاشی مسئلہ کے اصول اور نظریہ سے چنداں سروکار نہیں ہے۔ بلکہ وہ محض چند عملی معاملات و مشکلات سے واسطہ رکھتا ہے۔ اس لئے اس کا نقطہ نگاہ محدود اور مقامی ہے۔ سوشیل ازم موجودہ نظام کو مٹانے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ سوشیل ریفارم موجودہ سرمایہ داری کو بچانے کے لئے وجود میں لایا گیا ہے۔ کیونکہ موجودہ نظام کی خرابی خود سرمایہ داروں کے نزدیک مسلّم ہو چکی ہے۔ یہی باعث ہے کہ آج ڈارون کے حیوانی قوانینِ ارتقار —— قانون جہد للبقا اور قانون بقائے اصلح —— کی ہر گوشہ سے جدید اجتماعیات، اخلاقیات اور دینیات کی روشنی میں تعریف و تحدید کی جا رہی ہے۔ اور لاسافیر اور منچسٹر اسکول کے سرمایہ دارانہ اساسات اب ہر ملک میں کم وبیش مردود قرار پا چکے ہیں۔ "سوشیل پلان" (جماعتی و منصوبی معیشت) اور "سوشیل کنٹرول" (جماعتی و منصوبی ضبط و نگرانی) کے اصول کو امریکہ، فرانس

اور برطانیہ جیسی جمہوریتوں اور جرمنی، اٹلی اور ترکی جیسی فسطائی آمریتوں نے اپنے اپنے حالات کے مطابق تسلیم کرلیا ہے۔ مینچسٹر اسکول کی جگہ خود سرمایہ دارانہ معاشیات کے اندر جدید کیمرج اسکول،، نے اور ریکارڈو اور آدم اسمتھ کی جگہ، مل اور مارشل کے رجحانات اور تعریفات کے بموجب پیگو اور کینز نے لے لی ہے۔

بقیہ صفحہ ۲۷، سیاحت اندلس

بھی کام کاج چھوڑ کر باہر نکل آتی تھیں مجھے فوٹو لینے کے لئے اچھا موقع مل جاتا تھا۔ دوسری مرتبہ جب میں اندلس گیا تو بند روالے کا تماشہ بھی دیکھا بسیط اور سادہ زندگی میں انسان کی تفریحات خواہ وہ شرق میں ہوں خواہ غرب میں یکساں ہیں۔ انگلستان میں جب میں اندرونی حصوں میں رہا تو Punch & Judy Toby کتے کے تماشے دیکھے۔ یہ ہمارے ہاں کے پتلیوں کے تماشہ کی طرح کے ہوتے ہیں۔

رَبَّکَ فَکَبِّرْ

وحدت انسانی

از چودھری غلام احمد صاحب پرویز بی-اے

تاریخ عالم پر نگاہ ڈالیے۔ ہر دور اور ہر ملک میں آپ کو کچھ لوگ تو ایسے ملیں گے جو سلسلۂ ارتقاء ذہنی کی اولیں کڑی تھے۔ جنھیں نہ کچھ اپنے متعلق خبر تھی نہ اپنے ماحول کے۔ ارتباط جسم وجان کے لیے بہ تقاضائے طبعی وہ اپنی ضروریات کو پورا کر لیتے تھے اور بس۔ لیکن کچھ قومیں ایسی بھی نظر آتیں گی جو مادی ترقیوں میں اپنے ہم عصروں سے پیش پیش تھیں۔ جنھوں نے مادی اسباب سے فائدہ اٹھانے کی تدابیر سوچیں۔ سنگین قلعے بنائے مستحکم عمارات تعمیر کیں۔ سمندروں کے سینے چیر کر ان پر کشتیاں چلائیں۔ نئے نئے آلات اور قسم قسم کے اسلحہ جات تیار کیے۔ تہذیب و عمرانیت میں یہ لوگ اپنے ہمعصروں سے بہت بلند تھے۔ بابل و نینوا کے کھنڈر، مصر کے آثار قدیمہ، ٹکسلا کے زمین دوز شہر، چین کے عجائبات، انہی اقوام کی عظمت گذشتہ کی زندہ شہادتیں ہیں

چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

کیا یہ لوگ دنیا میں چلے پھرے نہیں۔ جس سے دیکھتے کہ جو لوگ ان سے پہلے ہو گذرے ہیں ان کا کیا انجام ہوا۔ وہ ان سے قوت میں بڑھے ہوئے تھے۔ انھوں نے زمین کو کھود رکھا تھا اور اس کو ایسا آباد کر رکھا تھا کہ انھوں نے بھی نہیں کیا۔ . . . . (سورہ ۳۰ آیہ ۹)

لیکن جہاں ہم تاریخ کے اوراق پر تہذیب و تمدن کے ایسے ایسے آثار دیکھتے ہیں وہاں ساتھ ہی ساتھ ہمیں ایک اور عجیب و غریب سلسلہ بھی نظر آتا ہے ہم دیکھتے ہیں کہ جو قوم دولت و حشمت کی مالک تھی اس کے انتہائی عروج میں خدا کا ایک بندہ پیدا ہوتا ہے۔ جو ان کی ان بڑھتی ہوئی قوتوں کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ انہیں خدا کے اٹل قانون سے ڈراتا ہے۔ اس کی سنت قدیمہ کی طرف ان کی توجہ دلاتا ہے۔ ان کے خیالات ان کی ذہنیت اور ان کے قلوب و نفوس میں ایک اور ہی انقلاب پیدا کرنا چاہتا ہے لیکن اسکی باتوں پر تمسخر و استہزا کرتے ہیں۔ اس سے اعراض و روگردانی برتتے ہیں اپنی قوتوں کے ہجوم اور طاقتوں کے نشے میں اس

کی پکار پر کان نہیں دھرتے۔

وکم ارسلنا من نبی فی الاولین - وما یاتیھم من نبی الا کانو بہ یستھزءون - فاھلکنا اشد منھم بطشا و مضیٰ مثل الاولین۔

اور ہم پہلے لوگوں میں بھی رسول بھیجتے رہے ہیں اور ان لوگوں کے پاس جب بھی کوئی رسول آیا۔ انھوں نے اسکے ساتھ استہزا کیا پھر ہم نے اُن لوگوں کو جو ان سے بھی زیادہ قوی تھے۔ ہلاک کر ڈالا اور پہلے لوگوں کی یہ حالت (ہلاکت) گذر چکی ہے۔

کلدانیوں کا تمدن اپنے اوجِ کمال پر ہوتا ہے کہ انہی میں کے ایک بت تراش کے گھرانے سے دعوتِ توحید کی آواز اٹھتی ہے اور جب وہ قوم اپنی سطوت و قوت کے بھروسے پر اس آواز کو دبانا چاہتی ہے تو ان کا تختہ اُلٹ دیا جاتا ہے۔ فراعنہ مصر کا آفتاب عروج و اقبال مہر نیمروز کی طرح درخشندہ و تابناک ہوتا ہے کہ انہی کی غلام قوم سے ایک چرواہا اُٹھتا ہے اور ان کی تمام شوکت و عظمت کو پانی میں بہا دیتا ہے۔ عاد و ثمود کی قومیں تہذیب و تمدن کی زندہ یادگار تھیں۔ اقوام لوط اور سبا کی مادی ترقیاں بھی کچھ کم نہ تھیں۔ لیکن حیا شعیب وصالح ولوط۔ انہی کے بھائی بند آتے ہیں اور اُنکی بڑھتی ہوئی قوتوں اور اُبھرتی ہوئی ترقیوں کو خاک میں ملا دیتے ہیں۔ یہ تو پھر پارینہ داستانیں سمجھی جائیں گی۔ ابھی کل کا واقعہ ہے کہ ایرانیوں کا تمدن ایک دنیا کے لئے ضرب المثل تھا۔ رومیوں کی عظمت و ہیبت ایک عالم میں غلغلہ انداز تھی۔ لیکن عربوں کی سی اونٹ چرانے والی، بادیہ نشین قوم میں، ایک امی معلم حقیقت ﷺ کی بعثت ہوتی ہے اور چند سال کے عرصہ میں ایران اور روم کا تمدن یوں مٹ جاتا ہے کأنہم لم یکن شیئا مذکورا۔ آج دیکھیئے۔ اقوام مغرب نے جس قدر مادی ترقی کی ہے اُس کی نظیر چشم فلک نے کم ہی دیکھی ہوگی۔ زمین کی انتہائی وسعتوں پر، پہاڑوں کی آخری بلندیوں پر، سمندر کی گہرائیوں میں، فضائے بسیط کی پہنائیوں میں۔ جہاں دیکھو انسان کا غلبہ نظر آتا ہے۔ فطرت کی ہر شئے ان کی غلام اور کائنات کا ایک ایک ذرہ ان کا تابع فرمان نظر آتا ہے۔ انسان کو دیگر حیوانات پر شرف اجبا حاصل ہونیکا جو قدیمی دعویٰ تھا ایک ایک قدم پر اس دعویٰ کی (بظاہر) زندہ دلیلیں ملتی ہیں۔ زمین کی مخفی قوتیں ان کے زیر تسخیر ہیں۔ آسمان کی آزاد بجلیاں ان کے حکم سے پابہ زنجیر ہیں۔ یہ تہذیب اور یہ تمدن، سرفرازیاں اور سربلندیاں انسان نہیں، انسانیت کے لئے باعث صد افتخار اور وجہ ہزار مباہات ہونی چاہئیں لیکن وہی آواز جو بابل و مصر سے اُٹھی تھی۔ وہی پکار جو مدائن و سبا سے کانوں میں آئی تھی۔ جس کی گونج بیت المقدس کی پہاڑیوں سے ٹکراتی تھی اور جس کے حسین و دلکش نغمے بطحا کی وادیوں میں فردوس گوش بنے تھے۔ اسی آواز کی صدائے بازگشت ہے جو آج بھی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یاد رکھو۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی۔ جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

جو شخص تاریخ کے ان واقعات کا سطحی نگاہ سے مطالعہ کرتا ہے۔ وہ فوراً اسی نتیجہ پر پہونچے گا کہ تہذیب و تمدن کے خلاف جس قدر یہ آوازیں بلند ہوتی رہی ہیں۔ ان کا مطمع نگاہ یہی ہے کہ انسان کو اس دنیا میں مادی ترقیوں سے روکا جائے اور اسے اسی سطح پر اُٹھایا جائے جہاں یہ اپنے عہد طفولیت میں تھا لیکن مبصر نگاہوں سے یہ حقیقت چھپی ہوئی نہیں رہ سکتی کہ واقعہ اس کے خلاف ہے۔ مادی ترقیوں کی جن بلندیوں پر انسان کو یہ پیغام سرمدی لے جانا چاہتا ہے ابھی تک ذہن انسانی نے باایں ہمہ ترقی و تمدن، ان کا خواب بھی نہیں دیکھا۔ اس کا اعلان ہے۔

وسخر لکم الیل والنھار۔ والشمس و القمر والنجوم مسخرات بامرہ۔ ان فی ذالک لایت لقوم یعقلون ۱۶/۱۲

اور تمہارے لئے مسخر کر دیا۔ رات اور دن۔ چاند اور تارے سب مسخر ہیں اس کے حکم کے ساتھ۔ اس میں سمجھنے والی قوم کے لئے نشانیاں ہیں۔

اس سے بھی جامع الفاظ میں فرمایا کہ

وسخر لکم مافی السموات والارض جمیعًا۔

اور آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب تمہارے زیر تسخیر کر دیا۔

انسان اس دنیا میں انفرادی زندگی بسر کرنے کو نہیں آیا۔ اس کی انفرادی زندگی اجتماعی تشکیل حیات کی ایک اہم کڑی ہے۔ اور انہی کڑیوں کا ربط وضبط کائنات کی لامتناہی زنجیر بنجاتا ہے۔ ہر انسان کا ہر ایک عمل اس نظام اجتماعیت پر اثر انداز ہوتا ہے اور یہی وہ کہربائی قوت ہے کہ اگر ایک کڑی کا کوئی حصہ اس سے ممتسک ہو جائے تو وہ تمام زنجیر میں یکساں سرایت کر جائے۔ لہٰذا انسان کے وہ تمام اعمال جن کو وہ اپنی ترقی کا آئینہ دار سمجھتا ہے۔ ایسے حدود فراموش ہونے چاہئیں کہ ایک انسان کی ترقی تمام انسانوں کی ترقی۔ اور ایک کا تنزل تمام کا تنزل کہلا سکے۔ ایک کی خوش بختی سب کی خوش بختی اور ایک کی زبوں حالی سب کی زبوں حالی کے مترادف ہو۔ لیکن اگر خوش بختی اور ترقی کسی ایک فرد۔ ایک خاندان۔ ایک قبیلہ یا ایک قوم میں محدود ہو کے رہ جائے تو یہ چند انسانوں کی ترقی تو ضرور ہوگی۔ انسانیت کی ترقی نہیں ہوگی۔ اب دیکھئے کہ جس تہذیب و تمدن اور جس ترقی و ترفع کے خلاف یہ آوازیں بلند ہوتی رہی ہیں۔ ان تہاذیب میں انسانیت کا کیا حال تھا۔

حضرت موسیٰ سے ارشاد ہوتا ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

"فرعون نے اپنی قوم میں منادی کرا دی کہ اے میری قوم کیا مصر کی سلطنت میری نہیں ہے۔ کیا یہ نہریں میرے ہی نیچے نہیں چلتیں۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو۔ میں افضل ہوں اس ذلیل شخص سے جو صاف بول بھی نہیں سکتا۔ اس کو سونے کے کنگن کیوں نہیں پہنائے گئے۔ یا فرشتے اس کے جلو میں پرا باندھکر آئے ہوتے۔" ۴۳/۵۱-۵۳

انہی الزامات میں یہ بھی تھا کہ

"فرعون زمین میں بہت متکبر ہو گیا تھا اور اس نے وہاں کے باشندوں کو گروہ گروہ بنا رکھا تھا۔ کہ ان میں سے ایک گروہ کا زور گھٹاتا رہتا۔ ان کے لڑکوں کو قتل کرا تا۔ اور ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھتا۔ وہ واقعی بڑا مفسد تھا۔" ۲۸/۴

عاد و ثمود اور لوط کی قومیں بھی ایسی ہی سرکش و متمرد تھیں۔ حضرت شعیب کی قوم کا یہ عالم تھا کہ خدا کی عطا کردہ نعمتوں پر بھی اپنی قوت و سطوت کے زور سے قبضہ جما رکھا تھا۔ اور جس چیز کو خدا مفت دیتا ہے۔ کمزور انسانوں کو اجازت نہ تھی کہ ان سے متمتع ہو سکیں۔ قرآن کریم نے صرف ایک واقعہ میں اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے۔

"اور جب وہ (حضرت موسیٰؑ) مدین کے کنویں (چشمے) پر پہونچے تو اُس پر مختلف لوگوں کا مجمع دیکھا جو پانی پلا رہے تھے (اپنے جانوروں کو) ان سے (الگ) ایک طرف کو دو عورتیں دیکھیں جو (اپنی بکریاں) روکے کھڑی تھیں۔ ان سے (موسیٰ نے) پوچھا کہ تمہاری کیا غرض ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں جب تک کہ یہ چرواہے اپنے جانوروں کو ہٹا کر نہ لے جائیں۔ (اس لئے کہ) ہمارے والد بہت بوڑھے ہیں۔" ۲۸/۲۳

اسی طرح سورۂ ہود میں ہے کہ وہ غریبوں سے محنت و مزدوری کراتے۔ لیکن اُن کا معاوضہ پورا نہ دیتے۔ ناپ تول میں کمی کرتے اور زمین میں فساد جاتے (۱۱/۸۵) چنانچہ جب اس سرکشی، اس نخوت و تکبر، اس جور و استبداد کی حد ہو چکی تو خدا کے غیر جانبدار قانون کے ماتحت ان اقوام کی تہذیب و تمدن کو بھی غارت

کردیا گیا کہ انسانیت اس تہذیب کے ہاتھوں ذبح ہو رہی تھی تفصیل کے لئے سورۃ قمر کا ابتدائی حصہ ملاحظہ فرمائیے

رومیوں کی تہذیب نے نوع انسانی کے ساتھ جس درندگی اور بربریت کا سلوک روا رکھا تھا تاریخ کا ایک ایک صفحہ اس سے داغدار ہے۔ معاشرتی دنیا میں یہ حالت تھی کہ رومۃ الکبریٰ کے بازاروں میں انسانوں کے بچے حیوانوں کی طرح فروخت ہوتے تھے۔ مذہبی نظام میں یہ کیفیت تھی کہ یہود تو خیر پھر بھی غیر مذہب کے تھے۔ خود عیسائیوں میں سے جو کسی دوسرے فرقے سے متعلق ہوتے ہرقل کا اعلان تھا کہ اس کے کان، ناک، کاٹ دیئے جائیں۔ گھر بار جلا دیا جائے۔ سیاسی معاملات میں یونانی مقنن اعظم سولن کا یہ مقولہ نافذ العمل تھا کہ معاہدہ مکڑی کا جالا ہے جو اپنے سے کمزور کو پھانس لیتا ہے اور قوی کے سامنے ٹوٹ جاتا ہے۔

انسانی ترقی کے اس انداز کی بھی جب حد ہو چکی تو آنیوالا انقلاب آیا۔ اور ضعیف و ناتواں انسانوں کو ان کی تہاذیب کا مالک بنا دیا۔

واورثکم ارضھم ودیارھم واموالھم وارضا لم تطؤھا۔ وکان اللہ علی کل شیء قدیرا	ان کے ملک، انکے گھروں اور انکے اموال کا تمکو مالک بنایا اور اس زمین کا بھی کہ جس پر تم نے ابھی قدم بھی نہیں رکھا اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اب تہذیب حاضرہ کو لیجئے۔ مغرب بہ حیثیت مجموعی ترقی یافتہ ہے۔ روئے زمین کے دوسرے انسانوں پر اس کا کیا اثر ہے۔ اس کو چھوڑیئے۔ خود یورپ کے مختلف ممالک اور اقوام کے ایک دوسرے سے کیسے تعلقات ہیں۔ اس کا اندازہ وہاں کی سیاسی فضا سے لگایئے۔ کسی قوم کو دوسری قوم پر اعتبار وسہ نہیں۔ کسی انسان کو دوسرے انسان پر اعتماد نہیں۔ عائلی زندگی میں میاں بیوی۔ باپ بیٹا۔ بہن بھائی، ایک دوسرے کی گھات میں لگے رہتے ہیں قومی زندگی میں ایک پارٹی دوسری پارٹی کو کچل دینے کی فکر میں رہتی ہے۔ ملکی زندگی میں ایک ملک دوسرے ملک کو نگل لینے کی تدابیر سوچتا ہے غرضیکہ آج وہاں۔

قیامت ہے کہ انساں نوع انساں کا شکاری ہے

اس میں شبہ نہیں کہ سائنس کے انکشافات اور مظاہر فطرت کے متعلق تجارب و مشاہدات صفحہ تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ لیکن جس دور اضطراب والتہاب میں یورپ آج گذر رہا ہے اس کی مثال بھی تاریخ عالم میں ملنی مشکل ہے۔ عدم اطمینان و فقدان سکون کی ایک آگ ہے جو مشتعل۔

نار اللہ الموقدۃ التی تطلع علی الافئدۃ	اللہ کی جلائی ہوئی آگ (کے) ہے جو دلوں پر چڑھ جاتی ہے۔

تمام مفکرین و مدبرین آئے دن سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں کہ اس ہلاکت و بربادی سے بچنے کی کوئی راہ ملجائے مگر

تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی۔

امن کی کانفرنسیں تخفیف اسلحہ کی موتمریں جمعیت اقوام کے اجلاس آئے دن منعقد ہوتے ہیں لیکن سوائے

اس کے کہ نشستند و گفتند و برخاستند۔

نتیجہ کچھ برآمد نہیں ہوتا۔ اور یہ سب اس لئے کہ ایک دوسرے پر اعتماد اٹھ چکا ہے۔ صلح کی گفت و شنید بھی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن دوسری طرف جنگ کی طیاریاں بھی بدستور جاری رہتی ہیں۔ تخفیف اسلحہ کی کانفرنس کے لئے نمائندہ بھی بھیجا جاتا ہے۔ اور ادُھر اسلحہ ساز کارخانوں کو بھی ہدایات نافذ ہوتی رہتی ہیں کہ دیکھنا کہیں اپنے آتشدانوں کو ٹھنڈا نہ ہونے دینا۔

اس بحران اور بوکھلاہٹ کی بنا پر پانچ دس سال اُدھر یورپ میں کئی ایک تحریکیں پیدا ہوئیں اور ناکام تجربات کے ہاتھوں شکست کھا کر بیٹھ گئیں۔ یورپ شخصیت سے جمہوریت کی طرف آیا اور اب جمہوریت سے اکتا کر ڈکٹیٹرشپ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ لیکن ڈکٹیٹرشپ میں بھی انسانیت جس امن و سلامتی میں پہنچ رہا ہے اس کی تصدیق آئے دن کے واقعات کر رہے ہیں۔ جرمنی نے ہٹلر کو قائد اعظم مانا۔ اور وہاں یہودیوں کے ساتھ جس قسم کا سلوک کیا گیا۔ دنیا کے سامنے ہے۔ یہودیوں کے خلاف یہ تمام سرگرمیاں سب اسی اختلاف سے زیادہ نسلی امتیاز پر مبنی ہیں اور یہ وہی جنون ہے جو یورپ سے اکثر اوقات اُٹھتا رہتا ہے۔ روس میں یہودیوں کے خلاف ہی کچھ ہوتا رہا۔ اب جرمنی میں آرین اور سامی کے تفوق کا سوال درپیش ہوا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ نیٹشے کے نظریہ فوق البشر کی ہی توسیع ہے۔ اٹلی میں فسطائیت پیدا ہوئی اور مسولینی کو خدائے قاہر کی قوتوں کا اوتار مانا گیا۔ ڈاکٹر ایچ فائنر اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے کہ اٹلی کے نوجوانوں سے ایک قسم لی جاتی ہے جس کی رو سے وہ اپنے تمام ارادوں اور خواہشات کو ڈکٹیٹر کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ہر ایک اسکول کی دیواروں پر فسطائیت کے دس آئینی اصول کندہ ہوتے ہیں جن میں حسب ذیل قابل غور ہیں۔

(۱) اس تحریک کو ماننے والا کبھی مستقل امن و سکون کا قائل نہیں ہو سکتا۔

(۲) مسولینی کبھی غلطی نہیں کر سکتا۔

(۳) ڈکٹیٹر کی زندگی ہر شے سے زیادہ قیمتی ہے۔

اسٹیٹسمین۔ مورخہ ۲۴ ۳/۳۵

روس میں اس سے بھی بڑھ کر ایک اور جنون پیدا ہوا اور انھوں نے ہر ایک اثبات پر نفی کا تیر چلانا شروع کر دیا

ہر چند اشتراکیت اور فسطائیت متوازی تحریکیں سمجھی جاتی ہیں لیکن ان میں بھی آپس میں بہت چل رہی ہیں۔ اشتراکئین کہتے ہیں کہ فسطائیت سے مفہوم یہ ہے کہ جو روا کراہ سے ذرائع پیداوار کی ذاتی ملکیت کی مدافعت کی جائے۔ اور فسطائی کہتے ہیں کہ اشتراکیت ایک بین الاقوامی سازش ہے جو تہذیب اور مذہب کے استہلاک کے لئے عمل میں لائی گئی ہے

(ملاحظہ ہو اسٹیٹسمین مورخہ ۲۶ ۲/۳۵)

امریکہ کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہاں اطمینان و سکون کی زندگی بسر ہو رہی ہے۔ وہاں کا نظم و نسق نظام حکومت، نظام معاشرت ایک ارضی جنت کا نقشہ پیش کرتا ہے لیکن اگلے دنوں اخبارات میں مسٹر ہوور سابق صدر کا ایک مکتوب مفتوح بمشر روزویلٹ موجودہ صدر کے خلاف شائع ہوا جس میں لکھا تھا کہ:

اس نظام حکومت سے تو انسانی آزادی و حریت کی بنیادیں گرائی جا رہی ہیں۔ حکومت کو واشنگٹن کے ایک دفتری نظام کے ماتحت مرکوز کر دیا گیا ہے۔ اور ایک وسیع ترین پیمانہ پر شخصی ملکیت و اقتدار کی پالیسی پر عمل پیرا ہونا شروع ہو گیا ہے۔ جماعتی تفریق کے جذبات عام ہو رہے ہیں اور لوگوں کو ان جرائم کی پاداش میں سزائیں دی جا رہی ہیں جو امریکہ کے تخیل حریت میں کبھی سما ہی نہیں سکتے۔ گورنمنٹ کے بڑے بڑے استوار حلقوں کو بے باکانہ توڑ دیا گیا ہے اور ملک ایسے قرضہ کی گرفت میں پھنس چکا ہے جو اس سے قبل کبھی دیکھنے سننے میں آیا تھا۔

(اسٹیٹسمین۔ بابت ۲۲ مارچ ۱۹۳۵ء)

یہ تو تھا نظام حکومت۔ نظام امنیت کی یہ حالت ہے کہ وہاں سال گذشتہ ۱۱ ہزار واقعات قتل ہوئے۔ گویا ایک لاکھ کی آبادی میں ۹۰۲ واقعات قتل حالانکہ ۱۹۰۲ء میں ایک لاکھ کی آبادی میں اوسط قتل ۱۰۴ تھا (اسٹیٹسمین ۷ جون ۱۹۳۵ء)

یورپ کی یہی فضا ہے کہ جس سے متاثر ہو کر وہاں کے بڑے بڑے مفکرین نے خود اپنی تہذیب کی تنقید و تنقیص شروع کر دی ہے۔ چنانچہ گذشتہ موسم بہار میں جب انگلستان اور روس کے درمیان باہمی مفاہمت کے مذاکرات ہو رہے تھے جریدہ اسٹیٹسمین نے اپنی ۳ اپریل ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا جو بڑا دلچسپ تھا۔ اس کے دوران میں وہ لکھتا ہے۔

تماشا ہے کہ گذشتہ پندرہ سال میں یورپ کے سیاسی مدبرین جہاں کہیں بھی مل بیٹھتے ہیں، خواہ وہ کسی قوم سے متعلق ہوں۔ اور ان کی امیدیں۔ آرزوئیں اور ارادے کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ ہر مصالحت و مفاہمت کی گفت و شنید کے مواقع پر بلا استثناء اس قسم کے الفاظ سننے میں آئیں گے کہ "ہم فلاں فلاں اقوام یورپ کے نمائندے بید مطمئن و مسرور ہیں کہ صاف صاف اور واضح الفاظ میں باہمی مبادلہ خیالات کی وجہ سے اب

ہماری حکومتوں کے درمیان بین الاقوامی مسائل سے متعلق کسی شعبہ میں بھی کوئی باہمی تخالفِ مفاد باقی نہیں رہا۔ اور انکی بنا پر اب باہمی امن وامان کے معاہدنگی بنیادیں بجید استوار ہوگئی ہیں۔ ہمیں کامل اعتماد ہے کہ اب آئندہ ہماری حکومتیں باہمی وفاق وفاشعاری سے کام لیں گی۔ یا یہ کہ "مسٹر فلاں اور فلاں، اپنے اس خیال میں پختہ یقین رکھتے ہیں کہ امن عامہ کے استحکام کی ضمانت کے لئے فلاں فلاں ممالک کے مابین رشتہ اخوت واتحاد کا قائم ہونا نہایت ضروری ہے "،

آگے چلکر اخبار مذکور لکھتا ہے :-

گذشتہ دو ہفتہ میں پیرس میں اس اصول کا اعلان ہوا۔ برلن میں اس کی تائید ہوئی اور ماسکو سے اسکی صدائے بازگشت آئی اور اس میں ذرہ بھر بھی شبہ نہیں کہ مختلف ممالک اور جمعیت الاقوام سے بھی اس کی تائید میں آوازیں اُٹھیں گی۔ لیکن اگر اس زریں اصول میں۔ جسے جنگ عظیم کے بعد سے اس وقت تک مختلف ممالک کے سیاست داں برابر دہراتے چلے آرہے ہیں۔ کچھ بھی حقیقت ہوتی۔ اگر یہ سیاست داں جو کچھ منہ سے کہتے ہیں اس پر اپنے دل میں بھی یقین رکھتے۔ تو آج یورپ میں یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا کہ صورتِ حالات ۱۹۱۴ء سے نازک ہے یا بہتر۔ اور نہ کوئی ملک ہمسایہ ملک کی تاخت وتاراج کے لئے اس قدر اسلحہ اندوزی میں منہمک ہوتا۔ اگر یہ سیاسی مدبر اور وہ لوگ جن کے یہ نمائندے ہیں اپنے ان اقوال پر کچھ بھی عمل پیرا ہوتے تو اس دنیا پر آج آسمانی حکومت کا سکہ رواں ہوتا۔ لیکن چونکہ عملاً صورت حالات اس سے کہیں مختلف ہے جو زبانی دعاوی میں پیش کی جاتی ہے۔ اس لئے آجتک کوئی بین الاقوامی مسئلہ مفاہمت سے حل نہیں ہوا۔

یہ افکار کسی مزید تبصرہ کے محتاج نہیں۔ فی الحقیقت یورپ کی تمام تہذیب کی روح اور اس کی موجودہ ذہنیت ان الفاظ کے اندر پوشیدہ ہے۔ قرآن کریم نے منافقین کے متعلق فرمایا ہے۔

تحسبھم جمیعًا وقلوبھم شتّٰی ۵۹/۱۴ بظاہر وہ اکٹھے معلوم ہونگے لیکن انکے دل ایک دوسرے سے الگ الگ ہونگے

سو بعینہٖ یہی حالت آج یورپ کے سیاسی مدبرین کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب ان کا ایک دوسرے سے یہ رویہ ہے۔ تو ان اقوام سے انکا کیا سلوک ہوگا جو ان کے برابر کی نہیں۔ کمزور ہیں مصر کی تہذیب میں اگر اگر ایک ہی شہر میں پیدا ہونے والے دو بچے پیدائشی اعتبار سے دو مستقل حیثیتیں رکھتے تھے جو تمام عمر انکے ساتھ وابستہ رہتی تھیں۔ تو آج حالات اس سے بہتر نہیں ہیں۔ علاوہ نسلی امتیاز کے آج جغرافیائی حدود اس درجہ

سخت گیر واقع ہوتی ہیں کہ ایک ہی زمین کے ایک انچ دائیں اور بائیں پیدا ہونے والے بچوں کے حقوق میں پیدائشی امتیاز ہو جاتا ہے حتیٰ کہ وہ گھر جنہیں خدا کی عبادت کے لئے مخصوص کیا جاتا ہے۔ اس میں بھی رنگ اور نسل اور زمین کا امتیاز باقی رکھا جاتا ہے عہد جہالت کے ایسے واقعات کو ہم وحشت و بربریت سے موسوم کرتے ہیں اس لئے کہ انکی تاریخ ہم نے لکھی ہے لیکن جب اس دور تہذیب کی تاریخ آنیوالی نسلیں لکھیں گی تو خدا معلوم کن کن ناموں سے ان کو یاد کریں گی۔ یہ غلط ہے کہ پہلی قومیں وحشی و جاہل تھیں۔ اس لئے وہ فنا ہو گئیں قرآن کریم شاہد ہے کہ۔

"ہم نے ان لوگوں کو ایسی قوت و سطوت دی تھی کہ تمہیں بھی ایسی قوت نہیں دی اور ہم نے ان کو آنکھ کان، اور دل دیئے تھے۔ لیکن چونکہ وہ قانونِ خداوندی سے انکار کیا کرتے تھے اس لئے ان کے کان اور آنکھیں اور دل اُنکے کچھ کام نہ آئے۔ اور جس بات کی وہ ہنسی اُڑایا کرتے تھے اس نے اُن کو آن گھیرا۔" $\frac{46}{26}$

دوسری جگہ عاد و ثمود کے متعلق ہے۔

وکانو مستبصرین۔ $\frac{29}{38}$ وہ چشم بصیرت رکھتے تھے۔

آج بھی یہی حالت ہے۔ تدبر و تفکر، تجسس و تفہم، عقل و شعور، علم و تمیز، سب کچھ موجود ہے لیکن چونکہ ذہنیت مختلف ہے۔ اس لئے یہ تمام ترقیاں۔ یہ تمام علوم و فنون کی کارفرمائیاں بجائے نوع انسانی میں امن و سلامتی پیدا کرنے کے استہلاک و تخریب کے ہولناک سامان فراہم کر رہی ہیں۔ آج سب سے بڑے سائنسدان سب سے بڑے فلسفی، سب سے بڑے حکیم کا دماغ اس تگ و دو میں منہمک ہے کہ ایک آنیوالی مزعومہ جنگ کے لئے وہ ایسے ایسے ہلاکت آفریں آلات ایجاد کرے۔ ایسے ایسے تخریبی نظریئے وضع کرے۔ ایسی ایسی خطرناک اسکیمیں تیار کرے کہ حریف مقابل ایک آن میں فنا ہو جائے۔ اور یہی وہ ذہنیت ہے جو انھیں رفتہ رفتہ غیر شعوری طور پر ہلاکت و تباہی کے مہیب غاروں کی طرف لئے جا رہی ہے۔

سنستدرجہم من حیث لا یعلمون $\frac{45}{44}$ ہم انکو بتدریج اسطرح لئے جا رہے ہیں کہ ان راہوں کی انہیں خبر بھی نہیں ہوتی۔

یہ خدا کا ناقابل تغیر قانون ہے جو آج بھی اسی طرح قائم العمل ہے جس طرح آج سے پانچ ہزار سال پیشتر تھا۔

"ہم نے ہر ایک کو ان کے اعمال کے بدلے پکڑ لیا۔ سو ان میں سے بعض پر تو تند ہوا چلا دی۔ اور بعضوں کو ہولناک آواز نے آن دبایا بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا۔ اور بعض کو غرق کر دیا اور اللہ نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن انھوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کر رکھا تھا۔" 29/40

ہندوستان کی تہذیب کے متعلق کچھ کہنا بیکار ہے پیدائشی امتیاز کی جن صورتوں کو دوسری جگہ معاشرتی آئین نے جائز قرار دے رکھا تھا یہاں مذہب کی بارگاہ عالیہ سے ان کے ناقابل تغیر ہونے کا لائسنس مل رہا ہے اور یہ انسانی غلامی کی ایسی پوتر زنجیریں ہیں کہ جن کو گلے میں پہننے سے پہلے ان کے سامنے انسان ڈنڈوت بھی بجالاتا ہے۔ برہمن کی خدائی کو دنیا کی کوئی قوت توڑ نہیں سکتی کہ دیوتاؤں کی شکتی اور رشی منیوں کی اشیرباد اس کے ساتھ ہے۔ ایک شودر کو جرات نہیں ہو سکتی کہ وہ اس زمین پر چل سکے جو برہمنوں کے لیے مخصوص ہے۔ وہ زبان بول سکے جو اونچی ذات والوں کے ہاں مروج ہو۔ یا وہ کھانا کھا سکے جو اُن کے ہاں استعمال میں لایا جاتا ہے۔ (ملاحظہ ہو کوچین میں اچھوتوں کے محافظ کی رپورٹ۔ بحوالہ اسٹیٹمین مورخہ ۱۲ر جولائی ۱۹۳۵ء) اس تہذیب کے اجارہ داروں کا یہ طرز عمل ان لوگوں کے ساتھ ہے جو ان کے ہم مذہب ہیں۔ ہم ملت ہیں۔ ایک ملک کے رہنے والے ہیں۔ جن میں کوئی جغرافیائی حدود حائل نہیں، رنگ اور مذہب کا فرق نہیں جب ان کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے تو ظاہر ہے کہ دوسری زمین کے باشندوں کے ساتھ۔ دیگر مذاہب کے متبعین کے ساتھ۔ دوسرے رنگ۔ نسل۔ قوم۔ ملت کے افراد کے ساتھ اُنکی ذہنیت کس قسم کی ہوگی۔ وسیع کائنات کی عالمگیر انسانیت اس حبسِ دوام میں کس طرح آزادی کا سانس لے سکتی ہے۔

لیکن ان سب کے برعکس جب دنیاوی ترقی اس مخصوص ذہنیت کے ماتحت ہوگی جس کا اشارہ پہلے کیا جا چکا ہے تو عام دنیا کا رنگ اس سے کہیں مختلف ہوگا۔ ان کی ترقی سے یہ مفہوم نہیں ہوگا کہ اپنی قوت کے قیام و بقا کے لئے وہ کمزور اور ضعیف انسانوں کا خون چوسنا شروع کر دیں۔ جائز و ناجائز کی تمیز اُٹھا دیں اور خدا کی وسیع زمین انسانوں پر تنگ کر دیں۔ بلکہ ان کے متعلق فرمایا کہ۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰة واٰتوا الزکوٰة وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔ وللہ عاقبة الامور۔ 22/41

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں متمکن کردیں توان کا کام لوگوں کو خدا کے راستے سے ہٹانے کا نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ خدا کی عبادات کو قائم کرینگے کمزوروں کی کمائی سے اپنے تعیش کے سامان فراہم نہیں کرینگے۔ بلکہ اپنی کمائی سے کمزوروں کی امداد کرینگے جو احکام صادر کرینگے ہر ایک کے لئے یکساں اور برحق ہونگے۔ اور جہاں جہاں بُرائی دیکھیں گے بلا امتیاز اعدے اس کو روکیں گے۔ اوران کا اورجن کے ساتھ ان کا معاملہ ہوگا۔ ان سب کا انجام کار خدا کے ہاتھ میں ہوگا۔ ان سب کی تہذیب میں تمام پیدائشی امتیازات جو ابدی غلامی کی اصل ہیں نابود ہو جائیں گے۔ پیدائش کے اعتبار سے ہر انسان برابر ہوگا اور عزت وتکریم کا معیار دنیاوی وجاہت اور قوت وحشمت نہیں ہوگی۔ بلکہ سب سے زیادہ واجب الاحترام وہ ہوگا۔ جو سب سے زیادہ خداترس ہوگا خواہ وہ ایک ادنیٰ غلام زادہ ہی کیوں نہ ہو۔

یاایہا الناس اناخلقنکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفو۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقکم۔ ۴۹ : ۱۳

لوگو ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا اور یہ قبیلے اور خاندان تو ایک دوسرے کی شناخت کا ذریعہ بنائے گئے ہیں۔ درحقیقت خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار رہے۔

نسبی امتیازات کے ساتھ ہی جغرافیائی حدود کے امتیازات بھی اُٹھ جائیں گے۔ ہر شخص کو خدا کی وسیع کائنات میں یکساں حقوق حاصل ہونگے۔ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ اور دونوں کبھی نہیں مل سکیں گے۔ یہ عہد جاہلیت کی باتیں قرار دیجائیں گی کہ اس تہذیب کا اصول ہے۔ کہ

للہ المشرق والمغرب

مشرق ومغرب سب اللہ کی جہتیں ہیں انمیں کوئی فرق نہیں

انکی سطوت میں حاکم ومحکوم، ادنیٰ واعلیٰ امیر وغریب سب انسان عدل وانصاف کی نگاہ میں برابر ہونگے مذہب ومسلک مشرب وملت۔ کسی چیز کا امتیاز نہیں ہوگا۔ کہ ان کے سامنے یہ اصول ہوگا کہ

لایجرمنکم شنان قوم ان لا تعدلوا۔ اعدلوا

کسی قوم سے دشمنی تمہیں کہیں اس بات پر آمادہ نہ کردے کہ اسکے ساتھ عدل وانصاف نہ برتو۔ ہر حال میں عدل کرو

ان کے عہد میں دین اور مذہب کے معاملہ میں کسی پر کوئی زبردستی نہیں ہوگی۔ تہذیب وتمدن کے دائرہ میں رہتے ہوئے ضمیر کی کامل آزادی ہوگی۔ کہ دین کا تعلق ان کے نزدیک صرف خدا سے ہے۔ کسی انسان سے نہیں۔ اس آزادی کو سلب کرنے کے لئے جو فتنہ اُٹھیگا وہ اُسے دبائیں گے حتیٰ کہ۔

ویکون الدین للہ

دین صرف اللہ کے لئے رہ جائے۔

انکی تہذیب میں وحدت انسانی کا تخیل ان بلندیوں پر پہنچا ہوگا کہ کسی ذہن کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکی کہ آئین الٰہی کے مطابق جملہ انسانوں کی تخلیق نفس واحدہ سے ہوئی ہے۔

هوالذی خلقکم من نفس واحدة...۷: ۱۸۹ وہی ہے جس نے تم (سب) کو نفس واحدہ سے پیدا کیا۔

وہ دنیا میں جتنی ترقیاں کریں گے ان سے غرض کوئی ذاتی مفاد حاصل کرنا نہیں ہوگا۔ بلکہ انسانیت عظمےٰ کا عام مفاد خالصۃً للہ ان کا مقصد زندگی ہوگا کہ ان کا نصب العین ہی یہ قرار دیا گیا ہے۔ کہ

قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العٰلمین۔ کہدے کہ میری نمازیں اور میری قربانیاں میرا جینا اور میرا مرنا محض اللہ کیلئے ہے جو تمام انسانوں کا رب ہے

گویا ان کی تہذیب ان اصولوں پر مبنی ہوگی جو ان کے خدا نے ان کے لئے بنائے ہیں اور چونکہ وہ خدا رب العلمین ہے اس لئے اس کے وضع کردہ اصولوں میں کسی انسان کی رو رعایت نہ ہوگی اور یہی وہ تہذیب ہے جس میں وحدت انسانیت پیدا ہو سکتی ہے کہ جس کا فقدان آج اور ہمیشہ سے دنیا میں اضطراب و عدم اطمینان کا باعث رہا ہے۔ وحدتِ خالق کے ایمان کا خاصہ ہی یہ ہوگا کہ اس سے وحدت مخلوق کا تخیل پیدا ہو اور یہی وہ تہذیب ہے جس کی روح اس حکم میں مضمر ہے جو سب سے پہلے خدا کا نام بلند کرنے کو دیا گیا۔ فرمایا۔

یا ایھا المدثر۔ قم فانذر۔ وربک فکبر اے کپڑا اوڑھنے والے اُٹھ اور لوگوں کو آگاہ کر دے اور اپنے رب کا نام بلند کر

مقصد یہ ہے کہ تم خدا کا نام بلند کرتے جاؤ وہ تمہارا نام بلند کریگا اور اگر وہ تمہارا نام بلند کرے تو تم بھی اس کا نام بلند کرو۔ غرضیکہ ایک ایسا دائرہ قائم ہو جائے جس کا مرکز خدا ہو اور محیط تمام نوع انسانی اس آسمانی بادشاہت کے ہر فرد کا مقصد حیات صرف وہ ہوگا جس کی طرف آیۂ کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی — وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ

اسرار توحید

مرسلہ سید امداد حسین صاحب توحید

جتنی بھی صداقتیں ہیں پنہاں ہیں یہاں
اور جتنی بناوٹیں ہیں عریاں ہیں یہاں
دانا ہیں صداقتوں کی تہ میں غرقاب
جو سطح پہ تیرتے ہیں ناداں ہیں یہاں

ہر روز طلوع اور ہر روز زوال
اس ظلم پہ بولے کوئی کس کی ہے مجال
یہ کیسا نظام ہے یہ کس کا ہے نظام
صانع کا کمال ہوگا مجھ پر ہے وبال

وہ جیسے ہیں بشاش ہم ایسے ہوتے
کہتے ہیں یہ قلاش ہم ایسے ہوتے
یہ بھی سوچا کہ کتنے دل سوچتے ہیں
تم جیسے ہو اے کاش ہم ایسے ہوتے

نظام دہر کو دہری بیان کر نہ سکا
دماغ فکر کو اپنی زبان کر نہ سکا
جو ہو رہا ہے یہ کیا ہے جو ہوگا کیا ہوگا
بیان خاک کرے گا گمان کر نہ سکا

توحید

عورت کی حیثیت

از شیخ سراج الحق صاحب بی۔اے ریلوے بورڈ۔ نئی دہلی

کہتے ہیں کہ شاہجہاں کو جب بیٹے نے قلعہ میں نظر بند کر دیا تو اس نے کہلا بھیجا کہ چند لڑکے میرے پاس بھیج دیئے جائیں جنکو میں پڑھاتا رہوں۔ آپ اس واقعہ کو سنکر مسکرا دیجئے معزول بڈھے کے اس جذبہ کو طفلانہ پن کہکر اس کی ہنسی اڑائیے لیکن یقین مانئے کہ آپ خود اپنی نفسیاتی کیفیت کا جب تجزیہ کرینگے تو معلوم ہو جائیگا کہ شاہجہان نے محض اپنے جذبات ہی کا اظہار نہیں کیا بلکہ نوع انسانی کے قلوب کی ترجمانی کی ہے۔ حکومت کا جذبہ انسان میں فطری معلوم ہوتا ہے ہر شخص کسی نہ کسی دائرے میں حکمران ہونا چاہتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ ہر شخص حکمران ہو کیسے؟ لہذا عام انسانوں نے اس جذبہ کی تسکین کے لئے احیال و عواطف سے کام لیا۔ احتیاج محکومیت و زیردستی کا دوسرا نام ہے۔ اس لئے انسانی زندگی میں جہاں جہاں اور جس جس گوشے میں احتیاج تھی وہیں زیردستی کے آثار ابھرنے شروع ہو گئے۔ بیٹا باپ کا محتاج ہے۔ اس لئے اس کا مطیع و فرمانبردار لیکن وہی باپ جب بیٹے کا دست نگر ہو جاتا ہے تو متبوع و مطاع ہو جاتا ہے۔ غریب دولتمند کا محتاج ہے۔ اس لئے خدمتگذار بھی ہے۔ شاگرد اُستاد کا محتاج ہے۔ لہذا استاد کا ہر قسم کا استبداد جائز ہی نہیں بلکہ ضروری سمجھتا ہے۔ لیکن یہ تمام حالتیں ایسی ہیں جن میں گردش دولابی جاری ہے۔ کوئی شکل مستقل نہیں ہے۔ ہر ایک کیفیت تغیر پذیر ہے اور انسان چاہتا ہے حکومت مستقل تاکہ وہ اپنے جذبہ کی تسکین میں کبھی زیادہ دقت محسوس نہ کرے۔ انسان کی قومی اور عمرانی زندگی میں ایک گوشہ ایسا ہے جہاں احتیاج کا یہ سلسلہ ناقابل تغیر ہے۔ یعنی مرد و عورت کے وظائف زندگی کی جو تقسیم فطرت کی طرف سے ہوئی ہے اس میں عورت اپنی زندگی کے بیشتر حصہ میں مرد کی حفاظت و کفالت کی محتاج رہتی ہے۔ حکومت طلب انسان کو یہ گنجائش خدا دے۔ اس نے عورت کے اس نازک پہلو سے ایسا فائدہ اُٹھایا کہ فطرت بھی اپنی ہنسی نہ تھام سکتی ہوگی۔ چنانچہ آپ دیکھئے کہ ایک ایسا مرد جو باہر کی دنیا میں ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کا زیر فرمان ہو جب گھر کی چار دیواری میں قدم رکھے گا تو جذبہ حکومت کی تمام امنگیں ایک ایک کر کے اُبھرتی چلی آئیں گی۔ حتیٰ کہ وہ ایک مطلق العنان حاکم کی صورت اختیار کرے گا کہ جسکے فیصلے کی کہیں اپیل نہیں۔ اور جس کے حکم کی کوئی تاویل نہیں۔ جب یہ جذبہ آپ انفرادی طور پر محسوس کرتے ہیں تو اندازہ لگایئے کہ انسان نے اپنے عہد طفولیت سے آج تک اس جذبہ کی تسکین کی خاطر عورت کو محکوم رکھنے کے لئے کیا

کچھ تدابیر نہ کی ہونگی۔ تمدن، معاشرت، عمرانیت، اقتصادیات، مذہب، رسوم، قانون۔ غرضیکہ ہر پہلو ہر گوشے سے مختلف زنجیریں پیدا کی گئیں جو مختلف ناموں سے عورت کو پہنائی گئیں۔ معتقدات کا غیر محسوس اثر سب سے گہرا نقش پیدا کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ سوسائٹی میں عورت کا وجود نہایت گھناؤنا اور ذلیل قرار پا گیا۔ ادنیٰ ترین مخلوق۔ بے روح کا انسان۔ منحوس ہستی۔ نوعِ انسانی کے تمام مصائب کی علت العلل۔ ہر ایک فتنہ و فساد کا بنیادی سبب۔ ناقص العقل اشر المکائد۔ غرضیکہ دنیا کا ہر معیوب خطاب اس کی طرف منسوب کیا گیا۔ نہ سوسائٹی میں اس کی پوزیشن ہے نہ کسی ملکیت میں اس کا کوئی حق ہے۔ نہ کسی معاملہ میں اس کی کوئی رائے ہے۔ نہ کسی فیصلہ میں اس کی بات کی کوئی وقعت ہے۔ یہ تھی وہ حالت جو انسانی استبداد نے اپنی ہی ہم جنس نوع کے ساتھ روا رکھ چھوڑی تھی۔ لیکن فطرت کو یہ غیر فطری تقسیم کس طرح سے مرغوب ہوتی۔ وہ اس ظلم ناروا کو کب تک برداشت ہونے دیتی۔ چنانچہ خالق فطرت نے اپنا پیغام انسانوں کی طرف بھیجا۔ اور اس میں کھلے کھلے الفاظ میں ظاہر کر دیا کہ تم نے نوعِ انسانی کی نصف آبادی کو غلامی کی جن بوجھل زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے یہ سر تا سر غیر فطری ہیں۔ ناروا ہیں۔ تمہارے جور و ستم کی زندہ مثالیں ہیں۔ تمہارے تسلط و تغلب کے ناخوش آئند جذبہ کی پائندہ داستانیں ہیں۔ یاد رکھو تمہاری تخلیق ایک نفس واحدہ سے ہوئی ہے۔ فرائض زندگی کا فرق صرف فطرت کے تقسیمِ عمل کا فرق ہے۔ اس سے آگے اور تمام امتیازات تمہارے اپنے پیدا کردہ ہیں جن کی تمہارے پاس کوئی سند نہیں کوئی سلطان نہیں کوئی دلیل نہیں۔ کوئی برہان نہیں۔ لڑکی پیدائش کی گھڑی سے منحوس خیال کی جاتی تھی قرآن کریم نے بالتصریح فرما دیا کہ یاد رکھو بیٹے اور بیٹیاں سب خدا کی دین ہیں۔ جسے چاہے بیٹے دے۔ جسے چاہے بیٹیاں دے۔ اس میں سعد و نحس کا کیا واسطہ۔ پھر باپ کے ہاں لڑکی کی پوزیشن خاندان کے مردوں کے رحم پر ہوتی تھی۔ انگلستان کے قانون وراثت میں لڑکی کا ذکر ہی نہ تھا۔ ہمارے ہندوستان میں جو کچھ لڑکی کو دیا جاتا تھا وہ دان ہوتا تھا۔ بطور استحقاق کے وہ کچھ نہیں لے سکتی تھی۔ قرآن کریم نے باپ کی وراثت میں لڑکی کا حصہ لازمی رکھا۔ اور وہ اسے بطور استحقاق وصول کر سکتی ہے۔ نکاح کے معاملے میں تو لڑکی اپنی زبان تک نہ ہلا سکتی تھی۔ جیون بندھن اس کی پیدائش سے بھی پہلے کا مقدر ہوتا تھا اور مرنے کے بعد تک رہتا تھا۔ قرآن کریم نے نکاح کے بارے میں عورت کو پورا پورا اختیار دیا ہے۔ پھر نکاح کو ایک معاہدہ قرار دیا ہے۔ ناقابل انفکاک سیکرے منٹ " Sacrement نہیں کہا۔ جب تک باہمی تعلقات کی خوشگواری سے گھر جنت ارضی کا نمونہ بنا رہے معاہدہ استوار ہے۔ لیکن اگر بعض حالات کے ماتحت اختلافات ایسے شدید و وسیع ہو جائیں کہ بنائے نہ بنے۔ تو بجائے اس کے کہ باقی عمر جہنم کی آگ میں بسر کی جائے مخصوص شرائط و قیود کے ماتحت اس معاہدہ کو توڑ دینے کی بھی اجازت دی گئی۔ گھر میں بیوی کی حیثیت ایک غلام کی سی

نہیں بلکہ رفیق حیات کی سی ہے۔ بیٹر کار کی سی۔ کچھ حقوق مرد کے عورت کے ذمے ہیں۔ کچھ عورت کے مرد کے ذمہ ہیں۔ ان کی ادائیگی۔ فرائض متعینہ کی بجا آوری۔ دونوں پر لازم ہے۔ دونوں میں سے جو بھی ان میں کوتاہی کرے۔ تساہل برتے تغافل پر اتر آئے۔ قابل مواخذہ ہے۔ پھر شوہر کے ترکہ میں بیوی کا حصہ ہے اس کے بعد بہ حیثیت ماں۔ اس سے حسن سلوک کا ارشاد ہے۔ احسان و مروت کا حکم ہے اور حکم بھی بڑا تاکیدی۔ پھر اولاد کے ترکہ میں بھی اس کا حصہ ہے۔ سوسائٹی میں اس کی شخصیت بجائے خویش مستقل ہے۔ انگلستان کے قانون و رواج کے مطابق شادی کے بعد عورت اپنا ذاتی تشخص بالکل کھو دیتی ہے۔ اس کی اپنی حیثیت خاوند کی حیثیت میں مدغم ہو جاتی ہے حتیٰ کہ اس کا اپنا نام بھی باقی نہیں رہتا۔ اس کا تعارف اس کے خاوند کی وساطت سے ہوتا ہے۔ برعکس اس کے اسلامی سوسائٹی میں عورت اپنا مستقل تشخص رکھتی ہے جو اس سے کسی حالت میں بھی الگ نہیں ہوتا۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ اسلام سے پیشتر عورت کی حیثیت کیا تھی۔ اور اسلامی شریعت نے اسے کہاں سے کہاں تک پہونچا دیا۔ اور پھر خوبی یہ ہے کہ عورت کی حیثیت کو اتنا بلند کر دینے کے باوجود تقسیم عمل کے لحاظ سے جو فطری اختلاف عورت و مرد کی تخلیق اور وظائف زندگی میں رکھا گیا ہے اسے کہیں نظر انداز نہیں کیا گیا۔ یورپ رد عمل میں ہمیشہ متشدد رہا ہے۔ وہاں کی عورتوں نے اگر آج مردوں سے انتقام لینا چاہا ہے تو وہ ''مساوات نوعی،، کی دھن میں یہ بھی بھول گئی ہیں کہ فطرت نے انکی تخلیق کا ایک مقصد رکھا ہے اور اس مقصد کی برآوری کے لئے انہیں نازک جذبات کا حامل بنایا ہے۔ عورت اس وقت تک عورت ہے جب تک وہ ان نازک حسیات کی مالک ہے ورنہ جس طرح ایک مرد زنانہ صفات و جذبات کی نقالی سے مرد نہیں رہتا۔ اسی طرح ایک عورت بھی مرد بننے کی ناکام کوشش میں اپنی مخصوص صفات کھو بیٹھتی ہے۔ عورت ہونا اور عورت ہی رہنا۔ کوئی ذلت کی بات نہیں، اس خصوصیت کو مٹانے کی ہوس فطرت کی تضحیک ہے۔ اگر اسے ایک زمانہ سے مرد کے استبداد نے ٹھکرا رکھا ہے تو وہ آئے اور دیکھے کہ اسلام کی تعلیم فطرت میں اسے کتنا بلند درجہ حاصل ہے۔ لہذا مرد و عورت کی تمیز اٹھانے کے یہ تمام وقتی ہنگامے بیکار ہیں حیا۔ رأفت محبت نرم دلی پرورش اولاد عصمت رفاقت وغیرہ عورت کی خصوصیات میں سے ہیں، یہ اس کے فطرت کی طرف سے عطیات ہیں۔ یاد رکھو جس نے فطرت کے قوانین کی خلاف ورزی کی وہ کوئی نوع ہو۔ کوئی قوم ہو۔ کسی ملک میں ہو کسی زمانہ میں ہو۔ فطرت اسے سزا دیکر رہے گی۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں۔

لیمپ

از سید نصیر احمد صاحب بی۔اے

ایک دن ابا جان نے امی جان سے کہا "اگر میں بھی لیمپ خرید لاؤں تو کیا حرج ہے؟"

"لیمپ؟ کیسا لیمپ؟" امی جان نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا تمہیں نہیں معلوم قصبہ میں ایک دوکاندار بہت سے لیمپ خرید لایا ہے۔ ایک لیمپ کی روشنی دس دیوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے جو گاؤں کے چوہدری کے پاس بھی ایسا ہی لیمپ ہے"

"اچھا وہی چیز جس کو کمرہ میں رکھدیا جائے تو چاروں طرف روشنی ہو جاتی ہے معلوم ہوتا ہے دن نکل آیا"

"بالکل ٹھیک۔ اس میں مٹی کا تیل جلتا ہے۔ شام کے وقت اس کو جلا دو تو صبح تک خود بخود جلتا رہتا ہے دیا تو کئی مرتبہ گل ہو جاتا ہے اور اُسے بار بار جلانا پڑتا ہے"

"لیکن مٹی کا تیل کیسے جل سکتا ہے؟"

"تم تو تیل کی خاصیت سے بھی واقف نہیں۔ مٹی کا تیل جلتا اور خوب جلتا ہے۔"

"لیکن کیا اس کے جلنے سے مکان میں آگ نہیں لگ جائیگی۔"

"آگ کیسے لگ جائیگی۔ جب وہ شیشہ کے ایک چھوٹے سے ڈبہ میں بند ہوگا۔ اور آگ بھی"

"شیشہ کے ڈبہ میں؟ اس میں آگ کیسے جل سکتی ہے۔ کیا یہ پھٹ نہیں جائیگا"

"کیا نہیں پھٹ جائیگا؟"

"شیشے کا ڈبہ"

"نہیں ڈبہ کبھی نہیں پھٹ سکتا۔ ہاں اُس وقت پھٹنے کا اندیشہ ہے جب آگ کو زیادہ اونچا کر دیا جائے"

"آگ کو کیسے اونچا کیا جا سکتا ہے"

"کیسے اونچا کیا جا سکتا ہے؟ ایک پرزہ ہوتا ہے اس کو گھمانے سے"

"پرزہ گھمانے سے۔ خوب۔ آپ تو مذاق کر رہے ہیں۔"

"سنو جب پرزہ کو دائیں طرف گھمایا جاتا ہے تو بتی اوپر چڑھ جاتی ہے۔ دیئے کی طرح لیمپ میں بھی

تمی ہوتی ہے لیکن ذرا مختلف جب اسکو بائیں طرف گھمایا جاتا ہے تو کم ہوجاتی ہے اور بالکل کم کردیجائے تو لیمپ گل ہو جاتا ہے،،

"یہ سب ٹھیک۔ لیکن میں ابھی تک کچھ نہیں سمجھی۔"
"جب میں لیمپ لے آؤنگا تو اس وقت سب کچھ سمجھ جاؤ گی"

"اور اس کی قیمت کیا ہے،،

"ساڑھے چار روپے۔ لیکن تیل الگ منگوانا پڑتا ہے،،

"ساڑھے چار روپے۔ توبہ۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ دو تین درجن اچھے دیئے خرید لئے جائیں۔ کیسی سستی چیز ہے خواہ مخواہ دام ضائع کرنے سے فائدہ۔،،

"نہیں دام نہیں ضائع ہونگے دیئے یہ کتنی دقتیں ہیں بار بار گل ہوجاتا ہے روشنی کم ہوتی ہے کچھ پڑھا لکھا نہیں جاتا

"خیر جیسی آپ کی مرضی،، امی جان نے کچھ سوچکر کہا،، دیا ہو یا لیمپ۔ مجھے تو روشنی چاہیے تاکہ اگر میں چاہوں تو رات کو بھی چرخہ کات سکوں۔ اچھا یہ لیمپ کب آئیگا۔،،

"کل۔ کیونکہ قصبہ میں مجھے چند اور بھی ضروری کام ہیں۔ میں چاہتا ہوں سب کو نپٹاتا آؤں۔،،

اُسیدن شام کو ابا جان لکڑی کا ایک بڑا سا ڈبہ لے آئے اور اس میں سوکھا گھاس اور کاغذ کے ٹکڑے ڈالنا شروع کیے ہم بچے تماشا دیکھنے ادھر اُدھر کھڑے ہوگئے۔ ہم پوچھ رہے تھے آخر اس ڈبہ میں گھاس اور کاغذ کیوں بھرے جا رہے ہیں اماں جان نے ہمیں ڈانٹ دیا کہ خاموش رہو لیکن ابا جان نے کہا کہ اس ڈبہ میں لیمپ رکھا جائیگا۔ چونکہ لیمپ شیشہ کا ہوتا ہے اس لئے اگر ڈبہ میں گھاس اور روئی نہ ہو تو ٹوٹ کر چکنا چور ہو جائیگا۔ ہمارا بڈھا ملازم رمضانی یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ مگر اُس نے اپنے منہ سے ایک بات نہیں کہی۔

دوسرے دن ابا جان لیمپ خریدنے روانہ ہوگئے۔ ہمیں دن بھر ان کا انتظار رہا۔ ایک اضطراب اور بے چینی ہمارے دلوں میں تھی۔ دوپہر کو ہم نے سیر ہوکر کھانا بھی نہیں کھایا۔ حالانکہ ہماری مرغوب چیز مچھلی پکی تھی۔ اماں جان نے بھی بہت کم کام کیا۔ وہ بار بار اُٹھکر کھڑکی تک جاتیں اور باہر جھانک کر دیکھتی تھیں کہ ابا جان آرہے ہیں یا نہیں۔ مگر بڈھا رمضانی دن بھر دیوں اور ڈیوٹوں کو صاف کرتا اور بتیاں بناتا رہا۔ حالانکہ اماں جان بار بار اُس سے کہہ چکی تھیں کہ اب ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں رہے گی

رات کو ہم کھانا کھا رہے تھے کہ گھڑگھڑاہٹ کی آواز سُنی اور ہم بے تحاشہ باہر بھاگے۔ لیکن ابا جان نے خفا ہوکر ہمیں واپس کر دیا۔ رمضانی ڈبہ اُٹھاکر اندر لے آیا۔

ابا جان نے بڑی احتیاط سے لیمپ باہر نکالا۔ رمضانی دیا لیکر پاس کھڑا ہوگیا اور ہم لوگ سامنے۔ انھوں نے لیمپ کو ہاتھ میں لیکر کہا۔ دیکھو یہ لیمپ ہے یہاں نیچے کے حصے میں تیل ڈالا جاتا ہے اور یہ جو چیز ہے اسے بتی کہتے ہیں۔ رمضانی ذرا دیا دور رکھو۔

"کیا یہ لیمپ اس وقت جلایا جائیگا"، امی جان نے پوچھا۔

"اسوقت کیسے جل سکتا ہے۔ اس میں تیل نہیں ہے۔"

"لیکن تیل تو ابھی ڈالا جا سکتا ہے"

"تیل۔ تم یہ بھی نہیں جانتیں۔ دوکاندار نے کہا تھا کہ آگ کے قریب اس میں تیل نہ ڈالنا ورنہ آگ لگ جانیکا خطرہ ہے۔"

"تو پھر اس میں تیل کب ڈالا جائیگا۔"

"دن کے وقت۔ کیا صبح تک انتظار نہیں کیا جا سکتا۔"

"کیا آپ نے اس کو اپنی آنکھوں سے جلتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"تم نے تو میرا سر کھا لیا"، ابا جان نے تنگ آ کر کہا، "میں نے اپنی آنکھوں سے جلتے ہوئے دیکھا ہے ایک بار نہیں کئی بار۔"

"تو اس کی روشنی خوب ہوتی ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"ہاں اتنی اچھی کہ فرش پر گری ہوئی سوئی بھی نظر آجاتے" یہ کہکر ابا جان نے لیمپ کو چھت سے لٹکا دیا۔

"آج رات تو ہمیں دیے ہی سے کام لینا پڑیگا" ابا جان نے کھانا کھاتے ہوئے کہا، "مگر کل ہی لیمپ جلایا کریگا۔"

"ابا جان۔" میں نے کہا آج رمضانی دن بھر بتیاں بناتا، اور دیوٹوں کو صاف کرتا رہا ہے۔"

"خیر کل سے کسی چیز کی ضرورت نہیں رہے گی"

اس رات مارے خوشی کے مجھے بہت کم نیند آئی۔ صبح کو میں اُٹھا تو معلوم ہوا کہ لیمپ شام کو جلایا جائیگا۔ یہ سنکر مجھے بہت افسوس ہوا۔ جی چاہتا تھا رو دوں۔

دوپہر کو ابا جان نے ایک بڑی سی بوتل نکالی اور اس میں سے ایک پانی جیسی مگر بدبودار چیز چھوٹی شیشی میں ڈالی۔ اس کے بعد لیمپ کو اُتارا اور اس کے کئی حصے کر ڈالے پھر ایک حصے میں وہ پانی جیسی چیز ڈالدی

ہم پوچھنا چاہتے تھے کہ یہ چیز کیا ہے لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی اس لئے کہ کام کرتے وقت ابا جان ڈانٹ دیا کرتے ہیں مگر امی جان خاموش نہ رہ سکیں اور انھوں نے پوچھ ہی لیا ،، یہ کیا کر رہے ہیں آپ ،،

،، تیل ڈال رہا ہوں ،،

جب تیل ڈال کر ابا جان نے اس کے حصے جوڑ دیئے تو اماں جان نے پوچھا ،، کیا اب آپ اسکو جلائینگے ؟ ،،

،، کیا اب ـ دوپہر کے وقت ،،

،، کیا حرج ہے ـ دیکھیں کیسا جلتا ہے ،،

،، بالکل ٹھیک جلے گا ـ شام تک انتظار کرو ـ اسقدر بے تابی کی کیا ضرورت ہے ،،

،، سہ پہر کو میں حسب معمول باہر کھیلنے چلا گیا ـ جب میدان میں پہونچا تو بہت سے لڑکے جمع ہو گئے اور پہلا سوال انھوں نے مجھ سے یہ کیا ،، کیا تمہارے ابا جان نے لیمپ خریدا ہے ،،

،، تمہیں کیسے معلوم ہو گیا ،، میں نے پوچھا ـ

،، ہمیں سب معلوم ہے ـ تمہاری اماں نے میری آپا سے ذکر کیا تھا ـ آپا کچھ اپلے لینے تمہارے ہاں گئی تھیں ـ اور بوا رحیمن نے بھی آ کر کہا تھا کہ تمہارے ہاں ایسا لیمپ آیا ہے کہ اگر فرش پر سوئی گر جائے تو وہ بھی مل سکتی ہے ،، ایک لڑکے نے جواب دیا

،، تمہارے ہاں بالکل ایسا ہی لیمپ ہے جیسا گاؤں کے چودھری کے پاس ـ تمہارے ابا ابھی ابھی یہ بات کہہ رہے تھے ،، دوسرا لڑکا بول اُٹھا ـ

،، ہاں بھئی ہم نے لیمپ خریدا ہے ـ لیکن اُسے رات کو دیکھنا ،،

اس کے بعد ہم نے کھیلنا شروع کیا اور شام تک کھیلتے رہے ـ

کھیل کود کر سب لڑکے ہمارے گھر کی طرف بھاگے ـ دروازہ کے باہر بڈھا رمضانی کھڑا تھا ـ ہم سب نے چلا کر کہا آؤ میاں رمضانی دیکھو لیمپ کیسے جلتا ہے مگر وہ خاموش رہا ـ

دروازہ کھول کر جب ہم کمرہ میں داخل ہوئے تو لیمپ جل رہا تھا ـ روشنی سے ہماری آنکھیں چندھیا گئیں جب آنکھیں مل کر ہم نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو کمرے میں ہمارے بہت سی ہمسائے جمع تھے ـ

،، دروازہ بند کر دو اختر ،، ابا میاں نے مجھ سے کہا ،، سخت سردی ہے ـ لڑکے سب قریب آ جائیں تاکہ اچھی طرح سے لیمپ کو دیکھ سکیں ـ ،،

ہم سب قریب جاکر بیٹھ گئے۔ اور لیمپ کو غور سے دیکھنے لگے۔
ہمارے ہمسائے ایک دوسرے سے بڑھکر لیمپ کی تعریفیں کر رہے تھے۔ ایک کچھ کہتا تھا دوسرا کچھ

بوا رحمن نے کہا کہ لیمپ ایسی تیزی اور شان سے چمکتا ہے جیسے آسمان پر چاند مولوی صاحب نے کہا

سب سے اچھی بات تو اس میں یہ ہے کہ دھواں نہیں دیتا۔ اُسے کسی جگہ لٹکا دیا جائے مگر چھت اور دیواریں

سیاہ نہیں ہوتیں۔ ماسٹر مولا بخش بولے اگر آدمی کافی دور بیٹھا ہو تب بھی بخوبی پڑھ سکتا ہے۔

"اس پر ابا جان نے مجھ سے کہا" اختر اپنی کتاب لو اور دروازہ کے قریب جاکر پڑھو۔ دیکھیں تم پڑھ

سکتے ہو یا نہیں"

میں نے اپنی کتاب اُٹھائی۔ دروازہ کے قریب گیا اور پڑھنا شروع کیا

"چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا — مسلم ہیں ہم وطن۔۔۔۔

ابھی پورا شعر بھی ختم نہیں ہوا تھا کہ سب لڑکے چلا اُٹھے۔ "تمہیں تو یہ نظم ازبر ہے۔ کوئی دوسری کتاب لو"

ماسٹر صاحب نے ایک کتاب دی میں نے کھول کر فر فر ایک دو صفحے پڑھ ڈالے۔

لڑکے بہت خوش ہوئے۔ اور چلا اُٹھے "واہ واہ"۔

"جب سب لوگ چلے گئے تو رمضانی اندر آیا۔ روشنی میں اُس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اُس نے

پوچھا "یہ چھت میں کیا چیز چمک رہی ہے"

"ذرا سوچو تو سہی" ابا جان نے جواب دیا۔

"میں نہیں جانتا" رمضانی نے کہا۔

"شاید آسمان سے کوئی ستارہ ٹوٹ کر یہاں آگیا ہے" ابا جان ہنس کر بولے۔

"شاید" یہ کہکر اُس نے اُنگلی سے لیمپ کو چھوا۔

"اس کو چھونے کی کیا ضرورت ہے آنکھوں سے دیکھو"

"بہت اچھا" اور یہ کہکر وہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

"مگر تھوڑی دیر بعد اماں جان نے اُسے بتایا کہ یہ نئی چیز لیمپ ہے جو تیل سے جلتا ہے

اب ان کو دیئے بتی کی کوئی ضرورت نہیں رہے گی۔
رمضانی کام ختم کر چکا تو باورچی خانہ میں دیا جلا کر بیٹھ گیا۔ حالانکہ وہاں لیمپ کی روشنی

پہنچ رہی تھی وہ اپنے جوتوں کو ٹھیک کرنے لگا۔ ہم لوگ مسکرا رہے تھے مگر اباجان نے اُسے دیکھا تو خفا ہو کر کہا، "تم نے چراغ کیوں جلا رکھا ہے اور کیا کر رہے ہو۔"

"میں اپنے جوتوں کو ٹھیک کر رہا ہوں۔"

"جوتے ٹھیک کر رہے ہو۔ اگر تمہارے لئے لیمپ کی روشنی کافی نہیں ہے تو پھر کونسی روشنی میں تم کام کرو گے؟ اگر تمہیں چراغ جلانیکا ایسا ہی شوق ہے۔ تو اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔ ہمارے یہاں اب چراغ نہیں جلنے کے۔"

رمضانی کچھ نہیں بولا۔ اپنا چراغ اُٹھایا۔ اور چپکے سے باہر چلدیا۔ ہم نے اسکو صحن میں سے جاتے ہوئے دیکھا چراغ کی دھیمی دھیمی روشنی میں۔

اس دن سے ہمارے ہاں کبھی چراغ نہیں جلا۔ اس بات کو ہر شخص مانتا ہے کہ پہلے لیمپ چودھری کے ہاں آیا اور پھر ہمارے ہاں۔ گاؤں کے دوسرے لوگ دیر تک لیمپ نہیں خرید سکے اور وہ اپنا کام چراغ کی روشنی میں کرتے تھے۔

رمضانی بھی دیر تک لیمپ سے مانوس نہیں ہوا۔ ہمیں کبھی کبھی چراغ کی یاد ستاتی تھی تو ہم خاموشی سے رمضانی کے کمرے میں جھانک لیتے تھے۔ وہ چارپائی پر بیٹھا حقہ پیا کرتا تھا چراغ اس کے سامنے ہوتا تھا ایک دن میں نے اُس سے لیمپ کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ اس نے کہا، "میاں ہم تو جاہل ہیں۔ مگر میں دیکھتا ہوں پرانی چیزیں مٹ رہی ہیں اور نئی آ رہی ہیں ہم غریب ہیں پھر نئی چیزیں خریدنا چاہتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔"

یہ اُس وقت کی بات ہے جب میں چھوٹا سا تھا۔ اب تو زمانہ ہی بدل گیا ہے ہمارے گاؤں کے ہر گھر میں لیمپ آ گئے ہیں۔ ایک آدھ بائیسکل بھی دکھائی دیتی ہے۔ کیا یہ چیزیں تکلف اور دکھاوے کے لئے استعمال ہوتی ہیں یا فائدہ کیلئے؟ ایک طرف ہم غریب ہوتے جاتے ہیں، دوسری طرف نئی نئی چیزیں دیکھکر خریدنے کو جی چاہتا ہے میں نے اکثر لوگوں کو نئی اور پرانی چیزوں پر باتیں کرتے سنا ہے لیکن کوئی بھی ٹھیک طور سے بتا نہیں سکا کہ کس چیز کو اختیار کرنا چاہیے اور کس کو نہیں یہ بھی ایک معمہ ہے کہ مفلس قوم کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ میں کہتا ہوں جب اس مسئلے کو بڑے بڑے دانا اور پڑھے لکھے آدمی بھی حل نہیں کر سکے تو غریب رمضانی کا کیا ذکر ہے۔ کیا معلوم وہ سچ ہی کہتا ہو۔

بحث و نظر

ہم اپنے مکرم دوست جناب پیر رفیع الدین صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے طلوع اسلام میں ایک نہایت دلچسپ بحث کی ابتدا کر دی ہے۔ پیر صاحب نے اپنی تعلیم کا اکثر زمانہ انگلستان اور جرمنی میں گزارا فلسفہ اور ادب سے انہیں خاص شغف رہا ہے وہ انگریزی اور جرمن زبان کے ماہر ہیں اور مغربی ادب کے ساتھ ساتھ انھوں نے بلحاظ فن تھیٹر اور سینما کا مطالعہ بڑی گہری نظر سے کیا ہے۔ لہٰذا اس باب میں ان کی رائے ایک خاص وقعت رکھتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اردو ادب کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس کو ہمارے نوجوان ادیب غور سے پڑھینگے۔ اس وقت سوائے چند مستثنیات کے ہمارے ادب کی وہی کیفیت ہے جو سوائے چند مستثنیات کے حالی سے پہلے کے ادب کی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ شعر اور قصائد کے ناپاک دفتر، کے ساتھ اب شعراؤ ڈراموں کے ناپاک دفتر کا اضافہ ہوگیا ہے۔ اس پر ایک مشترکہ زبان اور مشترکہ ادب کی دلفریب مگر بے معنی اصطلاحوں کا زور ہے۔ ممکن ہے ان کا یہ مضمون نوجوانوں کے اندر تنقید کا صحیح ذوق پیدا کر دے۔

پیر صاحب کی دو یہ تشخیص ،، ان کے آئندہ مضامین کی ایک مختصر سی تمہید ہے جو انشاء اللہ وقتاً فوقتاً طلوع اسلام میں شائع ہوتے رہیں گے۔ علی ہٰذا ہم پروفیسر فضل الدین صاحب قریشی کے بھی شکر گزار ہیں کہ انھوں نے مرشاہ سلیمان کے جدید نظریہ اضافیت پر ایک سلسلہ مضامین لکھنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ انھوں نے اپنے پہلے مضمون میں صرف چند مبادیات کی تشریح کی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آگے چل کر پروفیسر صاحب شاہ صاحب موصوف کے خیالات کی صحت و عدم صحت پر تفصیل کے ساتھ قلم اُٹھائیں گے — مدیر

ایک ادبی تشخیص

اردو ادب کا تخیلی سرمایہ

از رفیع الدین پیر

اردو ادب کے بعض پہلو نہایت درجہ یاس انگیز ہیں بالخصوص اس کا تخیلی سرمایہ جو اس وقت ہمارے زیر نظر ہے یعنی شعر، افسانہ اور تمثیل (ڈراما)

یوں دیکھنے میں ہماری ادبی خیال آرائیوں کی کوئی انتہا نہیں۔ افسانہ نویسی کا زور ہے۔ ہر سال نئے نئے قصے اور داستانیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ادبی رسائل کی کبھی یہ کثرت نہیں تھی جیسی کہ اب ہے۔ لاتعداد شاعر اور شاعروں کے ساتھ افسانہ نویسوں کی ایک جماعت جنھوں نے اپنے لئے بڑے بڑے شوخ اور محبت میں ڈوبے ہوئے تخلص مع تحریری نام، تجویز کر رکھے ہیں اپنے شوق غزل سرائی میں ورق پر ورق سیاہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کا ذہن ان کو پڑھتے پڑھتے عاجز آجاتا ہے۔ حال ہی میں گویا تصویروں کی بدولت فلم نویسوں کا ایک طبقہ دفعتہً پیدا ہوگیا ہے اور بظاہر اس وقت ہماری ادبی سرگرمیاں اس قدر وسیع ہوگئی ہیں کہ گذشتہ دس یا پندرہ برس پہلے ان کا کہیں نام بھی نہیں تھا۔

لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ یہ سارا جوش و خروش محض ایک سطحی حیثیت رکھتا ہے اور کہنے یا سننے والوں کی زندگی سے اسے کوئی حقیقی ربط حاصل نہیں، سوائے چند مستثنیات کے ادب اردو کا تخیلی سرمایہ ایک بے معنی طور ہے جس کے اندر کوئی ایسا دل ہلا دینے والا مقصد یا آرزو کام نہیں کرتی جس سے ہمارے افکار و جذبات کی دنیا میں وسعت پیدا ہو سکے۔ یہ ان لوگوں کا ادب ہے جنھیں ابھی اپنے صحیح اور حقیقی مزاج کو دریافت کرنا ہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی کیفیات شعور کے باہمی تناقض اور ہم آہنگی کا خیال رکھیں تاکہ ان کی حیات ذہنی اور گردوپیش کے عالم میں کوئی صحیح انقلاب رونما ہو جائے۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے۔ اور اس کے لئے ایک ایسے فرد کی ضرورت ہے جس کا شعور نہایت ہی واضح اور روشن ہو لیکن یہ وضاحت شعور صرف اس وقت ممکن ہے جب افراد اپنے اندرون ذات کے علاوہ بیرونی دنیا سے بھی ہم آہنگ ہو جائیں صرف یہی صورت ہے ایک عمیق اور واضح انفرادیت پیدا کرنے کی

جس کے ذریعہ ہم اپنے محسوسات حیات کا اظہار کر سکیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اردو ادبیات میں سوائے دوچار نامونکے اور کوئی بڑی شخصیت موجود نہیں ہمارے شعرا زندگی میں مطلق درک نہیں رکھتے نہ ان کے پاس کوئی مخصوص نصور ہے یہ اس لئے کہ انہیں اپنے سرچشمۂ حیات سے دور کا بھی تعلق نہیں اور وہ اپنی ادبی زندگی میں چند ایسی عادات کا جن سے ہم آگے چل کر تفصیل بحث کر سکینگے شکار ہو گئے ہیں کہ ان میں براہ راست کسی چیز کو اپنی تحریر میں لانے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی حالانکہ اس کے بغیر کسی ادب کا وجود ہی ممکن نہیں لہٰذا اردو ادب کا تخیلی سرمایہ جدت و تخلیق سے محروم ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں خیال آرائی کی کبھی گنجائش نہیں تھی۔ گویا اردو بولنے والی دنیا کی حس تخلیق ہمیشہ کے لئے شل ہو گئی ہے۔ ان کے اندر زندگی کی کوئی علامت نہیں بجز ایک اتفاقی اور ہلکی سی لہر کے جو ان کے شعور جمال کی سطح پر تھوڑی دیر کے لئے ظاہر ہو کر دفعتہً ختم ہو جاتی ہے۔ اردو شاعری کی ساری کائنات دوچار شخصیتوں تک محدود ہے۔ میر غالب اور حالی قدما میں۔ اکبر حسرت اور حفیظ دور حاضرہ میں۔ ہاں شیرانی کے اندر کبھی کبھی شاعری کی ایک جھلک ضرور نظر آ جاتی ہے۔ اقبال کا میں نے قصداً ذکر نہیں کیا اس لئے کہ وہ شاعر نہیں بلکہ شاعری کا ایک مظہر ہیں جس کا مقام سب سے الگ ہے۔

یہی کیفیت تخیلی نثر کی ہے اردو میں ناول نویسی کے عظیم الشان فن کی ابتدا پنڈت رتن ناتھ سرشار سے ہوئی اور انہیں پر اس کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ ان کے بعد جس کسی نے بھی اس میدان میں قدم رکھا سرشار کی عظمت اور بلندی کو نہیں پہنچ سکا مولانا نذیر احمد پر اخلاق و اصلاح اور تبلیغ کا رنگ غالب ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں اسی انداز اور ارادے سے لکھتے ہیں۔ مولانا شرر صحافت سے مغلوب ہیں اور مولانا خیری؟ ان کے متعلق سمجھ میں نہیں آتا آدمی کیا کہے۔ سوائے اس کے کہ انھوں نے گھر کی زندگی پر ضرورت سے زیادہ زور دیا ہے۔ البتہ حاجی بغلول اور امراؤ جان ادا کی بدولت ناول نویسی نے ضرور ایک کروٹ لی مگر یہ ایک عارضی جھلک تھی جس سے کوئی مستقل نتیجہ مرتب نہ ہوا۔ اگر قسمت کا بیرحم ہاتھ یاوری کرتا تو نبوق کی ذات سے جو ایک لمعۂ برق کی طرح ادب اردو کے آسمان پر ظاہر ہوئی ساری فضا ہمیشہ کے لئے منور ہو جاتی۔ ناول نویسوں کی طرح اردو میں ایسے افسانہ نویسوں کا فقدان ہے جو اس فن میں حقیقتاً کوئی صحیح ملکہ رکھتے ہوں۔ ہمارے سب سے پہلے افسانہ نویس محمد حسین آزاد تھے جن کے سحر قلم اور زبردست قوت بیان کا ہر شخص معترف ہے۔ انہیں افسانہ نویسی سے فطری مناسبت تھی اور وہ اس امر سے خوب واقف تھے کہ کسی افسانے کی ہیئت اور طرز ادا کیا ہونی چاہئے۔ انھوں نے اردو شاعری کی ایک تنقیدی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا لیکن جب انکی تصنیف اہل ملک کے سامنے آئی تو اس میں مختلف شعرا کے حالات زندگی اور قصص و حکایات کے ایک

دلآویز مجموعے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ انکے شوق افسانہ گوئی نے تنقید کی تنگ اور مختصر سی حدود کو توڑ کر خود بخود وہ شکل اختیار کرلی جس کے لئے وہ قدرتاً موزوں تھے۔ بہرکیف یہ ایک اتفاقی امر ہے کہ ہمیں افسانہ نویسی کے ضمن میں آزاد کا ذکر کرنا پڑا ہے۔ انھوں نے قصداً اس فن کی طرف توجہ نہیں کی لہذا ان کی بدولت اردو افسانوں کی دنیا میں کسی خاص چیز کا اضافہ نہیں ہوا۔

سجاد حیدر کی حیثیت اگرچہ باعتبار ان کے افسانوں کے اردو ادب میں ایک اجنبی کی سی ہے اور انکی داستانیں زیادہ تر دوسری زبانوں سے اپنائی گئی ہیں لیکن ان کے اسلوب بیان کی جدت اور خیال آرائی ہماری ادبیات میں ایک نئی چیز تھی۔ انھوں نے دوسری زبانوں سے جو کچھ لیا اس خوبی سے لیا کہ اس پر اصل کا شبہ ہونے لگا لیکن یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے صرف انکے پہلے مجموعۂ حکایات یعنی خیالستان کے متعلق۔ اس کے بعد انھوں نے جو کچھ کہا وہ خیالستان کی تخیل اور مضمون آوری سے خالی ہے۔ بہرحال اس وقت جب مغربی افسانوں کی ایک اندھا دھند اور بے رنگ نقالی کا بازار گرم ہے سید سجاد حیدر کا نام ہمیشہ مدح وستائش کے ساتھ لیا جائیگا۔

خواجہ حسن نظامی کی مثال گو ایک لاابالی ادیب کی سی ہے جس نے اپنے زبردست انداز بیان کو چند ادنیٰ اور پست خیال آرائیوں میں ضائع کردیا۔ لیکن یہاں ہم ان کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایک طرف ان کی جانب سے جا یہ خواہش کہ ان کی تحریریں معانی ومطالب سے پرہوں اور دوسری طرف ادنیٰ درجہ کی صوفیانہ واردات کے ساتھ لوگوں کو مخلوط کرنے کی کوشش کرنا۔ یہ دونوں باتیں خواجہ صاحب کے ایک اچھے ادیب بننے کے راستے میں حارج ہوئیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ممکن ہے وہ لیوس کیرول کی طرح ایک کامیاب خرافات نویس بن سکتے۔

اردو میں افسانہ نگاری کی ابتدا صحیح معنوں میں منشی پریم چند سے ہوتی ہے۔ ان کا انداز بیان اس قدر دلنشیں ہے کہ اس کی سادگی اور بے ساختگی کی ادا کو دیکھکر اکثر سعدیؒ کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو ہمارے ملک میں صرف وہی ایک افسانہ نویس ہیں۔ ان کے علاوہ جو لوگ بھی اس میدان میں آئے ہیں کسی طرح بھی منشی صاحب کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔

یہ لوگ یا تو محض نقال ہیں یا مترجم یا دوسروں کے خیالات اور چند فرسودہ مضامین پر بار بار قلم اٹھاتے ہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم قاضی عبدالغفار صاحب کو کس زمرے میں شامل کریں۔ وہ ایک معجز نگار اور غیر معمولی تخیلی قوت کے ادیب ہیں "لیلیٰ کے خطوط" سے قاضی صاحب نے ادب اردو میں ایک ایسی چیز کا اضافہ کیا ہے جس سے ان کی ندرت تخیل کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ اگر وہ اس تصنیف کے بعد جب معمول خاموش نہ ہوگئے تو امید ہے

کہ ان کا قلم اس سے بھی کہیں بہتر چیزیں ملک کے سامنے پیش کریگا۔

جہاں تک اُردو تمثیل کا تعلق ہے اس کے گذشتہ تیس برس کی تاریخ دراصل ایک فرد واحد کی شخصیت کی تاریخ ہے۔ ہمارا مطلب ہے آغا حشر کاشمیری سے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے علاوہ اور بہت سے ڈراما نویس بھی ہمارے تھیئٹر میں حصہ لیتے رہے۔ لیکن حشر کی ذات ان سب پر حاوی تھی۔ علمی اور فنی دونوں پہلوؤں سے انھوں نے آج تک اردو تھیئٹر کو اپنے قبضے میں رکھا۔ ان کے سامنے کسی دوسرے کا رنگ جمنا دشوار تھا۔

لہذا تیس برس تک حشر نے اپنے سحر قلم اور زندگی سے معمور شخصیت کی بدولت اردو تھیئٹر کو زندہ رکھا۔ وہ اپنے وقت کے ایک زبردست خطیب اور بذلہ سنج ادیب تھے۔ اور اسی کا اثر ان کے ڈراموں پر بھی رہا۔ راقم الحروف کی یہ قطعی رائے ہے۔ کہ بحیثیت ڈراما نویس آغا حشر کی کامیابی بڑی حد تک ان کے زور خطابت میں مضمر تھی اور انھوں نے ڈرامے کی جس شکل کو اپنے لئے انتخاب کیا وہ بھی خطیبانہ بلند آہنگیوں کے اظہار ہی کے لئے موزوں تھی۔ ہاں کامیڈی سے ضرور ان کی صحیح ڈرامہ نگاری اور قوت تخلیق کا پتہ چلتا ہے۔ لیکن کامیڈی سے بڑھ کر ان کی زبان تمثیل کیلئے اتنی موزوں نہیں ہوتی جتنی خطابت کے لئے۔ اسی لئے ان کی زبان ایک خطیب کی زبان ہوتی ہے نہ کہ ڈراما نویس کی اور وہ جب دلوں پر اثر ڈالتے ہیں تو اپنی خطیبانہ قوت اور زور بیان ہی کی بدولت۔ یہ نہیں کہ وہ افراد کی سیرت اور زندگی کے مختلف اور بدلتے ہوئے حالات کو اس کے لئے استعمال کریں۔ لہذا یہ ایک قدرتی امر تھا کہ وہ اپنے لئے اہم باتوں کا نہیں بلکہ عجیب باتوں کا انتخاب کریں اور تمثیل کی بجائے گفتگو حشر کے نزدیک زندگی میں تمثیلی شان صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس میں غیر معمولی جوش خروش اور اظہار جذبات کا وقت آئے۔ یہ نہیں کہ وہ زندگی کے تدریجی تغیرات، اس کی لطیف گردشوں اور حقیقی واقعات سے متاثر ہوں جو باعتبار کیفیت و حالات کہیں بہتر تمثیلی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور جن کو بیرون ہند کے جدید ڈراما نویس غیر معمولی بصیرت اور مذاق تمثیل نگاری کے ساتھ ہمیشہ زیر نظر رکھتے ہیں حشر کیلئے صرف زندگی کے ہنگامہ خیز لمحات ہی میں کچھ لطف آ تا ہے باقی جو کچھ ہے بے کیف اور بے مزہ انکو اعمال حیات سے کوئی مطلب نہیں وہ صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ان اعمال کا خاتمہ کہاں ہوتا ہے۔ گویا وہ اسباب پر نظر نہیں رکھتے۔ صرف نتائج کو دیکھتے ہیں۔ یا بالفاظ دیگر وہ احوال کو تمثیلی شکل میں پیش کرنے کی بجائے جو صحیح معنوں میں اسباب کو نتائج سے وابستہ رکھتے ہیں محض ان احوال کے اول و آخر سے بحث کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ طرز ایک خطیب ہی کا ہو سکتا ہے۔ ڈراما نگاری سے اسے کوئی تعلق نہیں اس طرح ڈراما نگار جو طویل مکالمہ تیار کرتا ہے اس میں اگرچہ لسانی اور تھیئٹری پہلوؤں سے زور و قوت اور حسن موجود ہوتا ہے۔ لیکن حرکت بہت کم۔ اس مکالمہ کا ہر ٹکڑا بجائے خود خطابت کا ایک نمونہ

ہوگا، ایک "تقریر" جیسا کہ ہمارے تھیئٹر کا عام رواج ہے۔ جہاں ابتک خطابت استیج پر جاری ہے۔

بہرکیف اردو ادب میں صرف آغا ہی کی ذات صحیح معنوں میں فن ڈراما سے متاثر تھی۔ اور اگرچہ اس بازار میں ان کے بہت سے نقال پیدا ہوگئے ہیں لیکن وہ ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ ان کی موت سے اردو تھیٹر ایک زبردست شخصیت سے محروم ہوگیا ہے اور یہ بات ذرا مشکل نظر آتی ہے کہ اس بلند مقام پر کوئی دوسرا شخص قدم رکھ سکے۔

اردو ادب کے تخیلی سرمایہ کی یہ کل کائنات ہے جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ اس تمام ادب کا جائزہ لیجئے اور پھر غور کیجیے کہ یہ ادب انسان (مرد اور عورت) کے متعلق کیا کہتا ہے۔ اس میں کہاں تک ہمارے خوف، دکھ سکھ، ہماری خوشی اور غم، امیدوں اور مایوسیوں کا تذکرہ موجود ہے بحیثیت ایک فرد جماعت اور ایک خاص سرزمین کے رہنے والوں کے اس میں ہم سے کیا کہا گیا ہے۔ لہذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ادب کے پیدا کرنیوالے جن واردات حیات سے متاثر ہوئے ان کی نوعیت کیا ہے اور وہ کہاں تک ان کو ادا کرسکے ہیں۔ کامیابی کے ساتھ یا ناکامی سے؟ اس ادب کے اساتذہ زندگی سے کہاں تک بہرہ مند ہوئے اور کس قدر خود انھوں نے اسمیں اضافہ کیا۔

اردو ادبیات پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائیگا کہ اس میں فرد کی ذات کبھی منظر عام پر نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے اس کی راہ میں ایک مسلسل رکاوٹ ہے جس کی بنا پر وہ اپنی ذات کے متعلق کچھ کہتا ہوا ہچکچاتا ہے گویا اس کی انفرادی واردات اظہار فن کے لئے موزوں نہیں۔ وہ کبھی براہ راست یا خود اپنی طرف سے گفتگو نہیں کرتا۔ بلکہ جو کچھ کہتا ہے۔ ایک عام انداز اور پردے میں۔ کلاسیکی ادب میں ہمکو براہ راست اور بیساختہ طرز ادا کی جو مثالیں ملتی ہیں وہ اردو ادب میں عام نہیں، شاذ ہیں۔ شاعر جو کہتا ہے زندگی اور اس کے عام احوال و شئون کے متعلق نحو سے اسے کوئی بحث نہیں۔

علیٰ ہذا خیالات کا رخ بھی یہ ہے کہ اردو زبان کا شاعر زندگی کے عام حالات سے اس کے مخصوص پہلوؤں کی طرف آئیگا یہ نہیں کہ جزو سے کل کی طرف بڑھے۔ زندگی پر اس طرح بے تعلق اور ایک عام نظر ڈالنا ہماری شاعری کی زبردست خصوصیت ہے۔ اس عادت کا سب سے نمایاں پہلو غالباً یہ ہے کہ جس قدر شاعر کے ذاتی اور مخصوص حالات ایک گہرا رنگ اختیار کرتے جاتے ہیں اسی قدر وہ انکا ذکر ایک عام اور مجرد شکل میں کرتا ہے اور جسقدر انکی حیثیت معمولی اور پست ہوگی اتنا ہی وہ ان کا اظہار براہ راست اور ذاتی رنگ میں کریگا یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں زندگی کے مخصوص اور ذاتی حالات کی جو مثالیں نظر آتی ہیں وہ نہایت بے کیف اور لطف سے خالی ہیں۔

علی ہذا اردو شعرا کا یہ رجحان کہ وہ اپنی تمام واردات پر علمی اور فلسفیانہ انداز سے غور کریں ایک ایسا مرض ہے جس سے ہماری شاعری میں جدت و بداعت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اس عجیب و غریب مرض کے اسباب اور اس کی صحیح نوعیت سے ہم کسی آئندہ فرصت میں بحث کرینگے۔ یہاں صرف اس کی طرف اشارہ کر دینا ہی کافی تھا۔ ہمارے ادب اور بالخصوص شاعری کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے حیات انسانی کو حرکت سے عاری سمجھ رکھا ہے اور اس کا تصور بطور نمو پذیر عمل کے نہیں کیا۔ گویا زندگی کیا ہے ایک ساکت اور بنی بنائی شے ۔ اردو شاعری کے اس پہلو کو دیکھکر مغلوں کے مذہب مصوری کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جس میں کسی منظر یا انسانی اجسام کو ان کی صحیح ہیئت میں پیش کرنے کا مطلق خیال نہیں کیا جاتا۔ اردو شاعری کو بھی نہ منظر سے بحث ہے نہ انسانی اجسام طیار کرنے سے۔ اس میں صرف اشیاء کی سطح کو دکھلایا جاتا ہے یہ نہیں کہ ان کے تینوں پہلوؤں ،،ابعاد ثلاثہ،، کا لحاظ کیا جائے۔ یہ گویا ایک طرف اشیاء اور دوسری طرف جذبات کا ایک ایسا مطالعہ ہے۔ جس میں نہ حرکت ہے نہ روانی۔

یہ رجحانات جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ عقلاً اور ذہناً چند ایسی عادات کا موجب ہوئے ہیں۔ جن سے ہمارے ادیب نہ اپنے دل کے اندر کوئی نیا القاء یا وجدان محسوس کرتے ہیں نہ خارج سے انہیں کوئی تحریک ہوتی ہے۔ ان کا بیرونی دنیا سے اپنی آنکھ بند کرنا گویا اپنی ذات سے آنکھ بند کر لینا ہے۔ چنانچہ جب کبھی ہمارے ادیب ڈرامایا افسانہ لکھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کا یہ عیب فوراً ظاہر ہو جاتا ہے تمثیل یا افسانہ نگاری میں ہم اپنی قوت خیال سے ان افراد کی زندگی میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ جن کے متعلق ہمارا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ فی الواقعہ بیرونی دنیا میں موجود ہیں اور یہیں پتہ چلتا ہے کہ ہمارے مصنفین اپنے ارد گرد کے حالات سے کس قدر ناواقف ہیں۔ وہ یا تو الفاظ و معانی میں گم ہو جاتے ہیں یا حقائق سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ جہاں تک واقعات بیانی کا تعلق ہے۔ بیرنگ اور بے تخیل واقعات کا وہ جو کچھ کہتے ہیں ٹھیک کہتے ہیں۔ بعینہ جس طرح پولیس کا کوئی عہدیدار واقعات قلمبند کرتا ہے۔ لیکن جہاں تخیل کی کارفرمائی کا وقت آتا ہے ہمارے افسانہ نگار حقائق کی دنیا سے آزاد ہو جاتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اب انکی پرواز محض خلا میں ہے۔ ان سے تو یہ بھی ممکن نہیں کہ مشاہدہ و تخیل میں کوئی توازن قائم رکھ سکیں بالفاظ دیگر وہ اپنے روزمرہ کے مشاہدات سے خیال و فکر کی کوئی ایسی دنیا تعمیر نہیں کر سکتے جو دیکھنے والوں کو حقیقی اور واقعی نظر آئے اور سامعین یقین ہو کہ ان کے سامنے جو کچھ ہے سچ مچ کے واقعات۔

جدید نظریہ اضافیت

از پروفیسر فضل الدین قریشی۔ ایم۔ ایس۔ سی۔ علیگ

جدید نظریہ اضافیت کی بنا ریاضیات پر ہے اور اس کی تصدیق چند فلکی مشاہدات کے علاوہ بعض ایسے تجربات سے بھی ہوتی ہے جن کا تعلق طبیعات سے ہے لیکن اس نظریہ کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے ایک سرسری نظر نیوٹن کے میکانیاتی اصولوں اور آئین اسٹائین کے نظریہ اضافیت پر بھی ڈال لینی چاہیے تاکہ اضافیت جدید کی اہمیت اور ضرورت واضح ہو جائے۔ سردست ہمیں صرف ان اصولوں سے بحث کرنا ہے جس پر اس نظریہ کی عمارت قائم ہے اور یہ دیکھنا ہے کہ ان سے کیا نتائج مترتب ہوتے ہیں۔ ان اصولوں کے ریاضیاتی پہلو یا فلکی مشاہدات اور طبیعی تجربات سے ان کی تطبیق و تصدیق کے متعلق ہم کسی دوسرے مضمون میں اظہار رائے کرینگے۔

میکانیات (Mechanics) میں نیوٹن کا شہرۂ آفاق کلیہ "جذب ثقل" Gravitation- اس عقیدے پر مبنی ہے کہ مادی اجسام کی یہ قوت بلحاظ فاصلہ ایک دوسرے پر اثر کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ ساکن اور متحرک اجسام پر اسکا اثر یکساں ہوتا ہے لیکن زمانہ مابعد کے فلکی اور طبیعی مشاہدات اسکے مخالف ہیں۔ نیوٹن مکان اور زمان کو مطلق تصور کرتا ہے حالانکہ یہ دونوں خلاف واقعہ ہے مثلاً زمین کا اپنے محور کے گرد دن رات میں گردش کرنا یا آسمان کا زمین کے گرد حرکت کرنا دونوں باتیں صحیح تسلیم کی جاسکتی ہیں۔ نیوٹن کا یہ بھی خیال تھا کہ نور کی رفتار غیر متناہی ہے۔ مگر بعد کے تجربات نے یہ ظاہر کیا کہ اسکی رفتار محدود اور معین ہے (۰۰۰،۰۰۰، ۳ کیلو میٹر یا ۰۰۰، ۱۸۶ میل فی ثانیہ) نیوٹن کی میکانیات ایک علیم اور مافوق الفطرت انسان کے لئے وضع کی گئی ہے جو دور کی اشیا کو فی الفور دیکھ سکتا ہے اور جسے یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ مکان و زمان کو ناپ سکے گویا اس انسان کا قاصد لامتناہی رفتار سے چلتا ہے اور اسے جملہ رفتاروں اور ان کے اسراع کا بیک وقت پتہ دیتا ہے۔ چونکہ نیوٹن کے نزدیک قوتوں کی رفتار لامتناہی تھی اور ان کا اثر فوری لہذا اجسام کا متحرک یا ساکن ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ لیکن ایک انسان صرف نور ہی کو اپنا تیز ترین قاصد بنا سکتا ہے جس کی رفتار محدود بھی ہے اور معین بھی۔ علیٰ ہذا جن قوتوں کا اسے تجربہ ہوتا ہے ان کی رفتار بھی متناہی ہے اور اثر وقت طلب۔ لہذا نیوٹن کی میکانیات تیز رفتار اجسام کے لئے تصحیح کی محتاج ہے۔

البتہ آئین اسٹائین نے اس کلیئے کو کسیقدر زیادہ صحیح شکل میں پیش کیا ہے۔ اس نے نیوٹن کے اصول

کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے وہ مکان و زمان اور حرکت کی مطلقیت کا قائل نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ کوپرنیکس اور قدما کا یہ نزاع کہ آیا زمین گردش میں ہے یا آسمان محض سہولت فہم پر مبنی ہے چونکہ ہر حرکت اضافی ہے لہٰذا اوپر کے دونوں بیانات میں (سکون یا حرکت زمین) کوئی اختلاف نہیں۔ بایں ہمہ آئین اشٹائین حرکت محوری اور حرکت کی نوری تبدیلی کو مطلق سمجھتا ہے۔ اسی طرح اس نے رفتار نور کو محدود تسلیم کرنے کے باوجود مطلق اور صفت لاتناہیت سے متصف تصور کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ دنیا کی تیز ترین رفتار کو اس میں جمع یا منفی کرنے سے کوئی فرق نہیں آتا۔ اس کے نزدیک زمانہ اور کمیت رفتار پر مبنی ہے لیکن اس کے باوجود کسی جسم کے ناظر کے اس سے قریب یا دور ہونے سے ان میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوگا۔ نظریہ اضافیت کی رو سے کسی جسم کا طول حرکت کی سمت میں کم ہو جاتا ہے زمانہ مکان کا بعد رابع ہے جس سے مکان کے اندر انحناء اور دوسری خصوصیتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بایں ہمہ وہ مکان خال سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے لئے اسے اثیر کے وسیلے کی ضرورت نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ مکان محدود ہے لیکن اسکے حدود تک پہنچنے کے لئے لامتناہی وقت صرف ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ مترتب ہوا کہ وقت طے شدہ فاصلے کے مطابق سست اور بالآخر ساکن ہو جاتا ہے۔ اس طرح فیثاغورث کا مسئلہ ابعاد اربع تک وسیع ہو جاتا ہے اور ہمیں یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ دو حوادث کے درمیانی وقفے کا مربع مکانی بعد کے مربعے اور نور کے طے شدہ فاصلے کے مربع کے باہمی فرق کے برابر ہوگا گویا اگر ہم شعاع نور بنکر نظام شمسی کے گرد سفر کریں اور دہلی سے دس بجے روانہ ہو مشتری سے منعکس ہوتے ہوئے زحل تک جائیں، اور پھر دوسرے سیاروں سے منعکس ہوتے ہوئے شام کے ۵ بجے لاہور پہنچ جائیں تو یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اس میں کتنا وقت صرف ہوا۔ اس سے یہ ماننا لازم آتا ہے کہ ہمارا عالم نہ صرف محدود بلکہ لغایت مختصر بھی ہے اور مکان بذات خود مکان کے اندر وسیع ہو رہا ہے۔

آئین اشٹائین نے دو اجسام کے درمیان ایک اور قوت یعنی قوت دفاع کا وجود بھی فرض کیا ہے جو بلاواسطہ بعد فاصل پر عمل پیرا ہوتی ہے بلکہ جس کی شدت اجسام کے درمیانی فاصلے کے بڑھنے سے خلاف قیاس طور پر زیادہ ہو جاتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جملہ عالم ایک آتشگیر مادے کی طرح نہایت سرعت سے منتشر ہو رہا ہے لیکن ہمارا نظام فلکی شاید قدرت کا منظور نظر ہے کیونکہ وہ اس کلیے سے مستثنیٰ ہے یہ اس لئے کہ ہمارے دور و دراز ستارے اپنے درمیانی فاصلوں کی متناسب رفتاروں سے منتشر ہوتے نظر نہیں آتے نظریہ اضافیت کی شومیٔ قسمت دیکھئے کہ کم از کم پانچ عدیم (Nebnlae) کافی تیز رفتار سے ہمارے قریب آ رہے ہیں۔ ہم ان کی رفتاروں کو اچھی خاصی طرح سے ناپ سکتے ہیں۔ البتہ ان کی حرکات کی توجیہ نظام فلکی کی حرکت رجوی سے بھی ممکن نہیں نظریہ

اضافیت کی رو سے ہر جسم اپنا ایک مخصوص اور جداگانہ وقت رکھتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو دو متحرک اجسام کا بیک وقت ایک دوسرے پر عمل پیرا ہونے کا مسئلہ ناقابل تشریح ہو جاتا ہے۔

یہ بظاہر بعید از فہم اور دور از ادراک مسائل بیس ہا برس تک تسلیم نہیں کئے گئے تا آنکہ آئین شٹائین کے مفروضہ مساوات کی تصدیق میں عجیب و غریب مظاہرے ہوگئے۔ اول کسی ستارے کی روشنی کا انصراف جبکہ وہ سورج کے قریب سے گذرتی ہو۔ دوسرے فرون ہوفر (Fraunhoffer) کے طیفی خطوط کی تبدیلی مقام اور تیسرے سیارہ عطارد کے نقطہ راس کے اقدام سے۔ اگر ان مظاہر فطرت سے نظریہ اضافیت کی تصدیق نہ ہوتی تو اس کا قائم رہنا دشوار تھا۔ کسی بہتر نظریئے کی عدم موجودگی میں اب اس نظریے کو صحیح تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر اب کچھ دنوں سے اس بات کا ثبوت مل گیا ہے کہ اضافیت کی یہ مفروضہ تصدیق بھی صحیح نہیں۔

اول یہ کہ نیوٹن کے نظریے کے مطابق روشنی کا انصراف ۰٫۸۷ دقیقہ ہونا چاہیئے۔ آئین اشٹائین کے نزدیک بقدر ۱٫۷۵ دقیقہ لیکن فروینڈلش (Freundich) اور کلیوبر (Kluber) نے ۱۹۳۱ء میں اسے ۲٫۲۴ + ۰٫۱۰ دقیقہ پایا۔

دوسرے یہ کہ آئین اشٹائین کے نزدیک طیفی روشنی کا انصراف ۰٫۰۰۸۴ دقیقہ ہونا چاہیئے لیکن سینٹ جان کے مشاہدے سے یہ انکشاف ہوا کہ اس کا انصراف ۰٫۰۰۳۴ دقیقہ ہے۔

تیسرے یہ کہ آئین اشٹائین نقطۂ راس کی اقدام کی قدر ۴۲٫۹ دقیقہ بتلاتا ہے حالانکہ مشاہدات کی رو سے اس کا شمار ۴۰٫۰۰ دقیقوں پر ہوا۔

اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حرکیات کے معمولی اصول جب ان کا اطلاق دو متحرک اجسام پر کیا جائے ان مساوات کے تبدیل شدہ مقامات میں ترمیم کر سکتے ہیں جو تخمینہ اول میں نیوٹن کی مساوات اور تخمینہ دوم میں آئین اشٹائین کی مساوات کے مشابہ ہو جائیں تو نیوٹن کی میکانیات اپنی سابقہ حیثیت پر جو نظریہ اضافیت نے اس سے چھین رکھی ہے برقرار ہو جائیگی پھر ہمیں ان مفروضات کو تسلیم کرنے کی ضرورت نہ رہے گی جن پر اضافیت کی اساس قائم ہے اضافیت کی تغلیط کے لئے جن امور کی ضرورت ہے وہ یہ ہیں۔ (۱) جو نظری قدریں مساوات سے ماخوذ ہیں وہ ناظر کی قدروں سے زیادہ مطابقت کریں نیز (۲) روشنی کا انصراف نیوٹن کے قانون کے مطابق ۲٫۳ گنا زیادہ اور فراؤن ہوئیفر کے خطوط کی تبدیلی مقام اضافیت کی قدر کے نصف (۳) علیٰ ہذا مشتری کے نقطہ راس کے اقدام کی نظری قدر ناظر قدر سے قریب تر ہو جائے (۴) ہر ایک سدیم کی رفتار قربی اور بعدی صحیح اور جائز سمجھ لی جائے۔ جدید نظریہ اضافیت کا یہی دعویٰ ہے کہ مساوات

کی ان ترمیم شدہ اشکال کو حاصل کرنا ممکن ہے۔

آئین اشٹائین کے نظریہ اضافیت کی بجائے صرف ایک مفروضہ جو بالکل قدرتی اور واضح ہے صحیح تسلیم کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ تمام اثرات اپنے عمل کے لئے وقت کے محتاج ہیں۔ ان کا عمل فی الفور نہیں ہوتا۔ حرکیاتی زبان میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی رفتار لاانتہاہی نہیں بلکہ محدود اور مقرر ہے سطح ارض کے ان جملہ تجربات کی توضیح جن میں رفتاروں کے اضافی کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اس مفروضے کے پہلے لازمی نتیجے سے ہو جاتی ہے یہ اس طرح کہ دو متحرک اجسام کی حرکت اضافی جسے ایک متحرک قاصد کے ذریعے ناپا جائے ان میں سے کسی ایک کے ساکن ہونے سے مختلف ہو جائے گی تمام فلکی مشاہدات جنہیں سیاروں کے نقطۂ راس کا اقدام، انصراف نور اور طیفی خطوط کا اپنے مقام سے ہٹنا شامل ہے نیز سطح ارض کے تمام مشاہدات کی تشریح اس مفروضے کے دوسرے لازمی نتیجے سے ہو جاتی ہے اور وہ یوں کہ جہاں کہیں بھی کوئی میدان جذب ثقل اور اشعاع کا ہو یا برق اور مقناطیس کا تو اس کا عمل ایک متحرک جسم پر ویسا ہی ہو گا جیسا اس متحرک جسم کو ساکن مان لینے پر اور اس اثر کو بجنسہ اس متحرک جسم کی سمت رفتار کی طرف ایک ایسے زاویے پر مائل سمجھ لیا جائے جو اس اثر اور جسم متحرک کی رفتاروں کے متناسب ہو گا۔ زامرفیلڈ (Sommerfeld) کے طیفی خطوط کی لطیف بناوٹ اور اس قسم کے دوسرے مسائل کا حل مفروضہ مذکورہ بالا کے تیسرے لازمی نتیجے سے ہو جاتا ہے۔

جسٹس سر شاہ محمد سلیمان نے اپنے نظریہ اضافیت جدیدہ سے نہ صرف گلیلیو اور نیوٹن کی میکانیات کی تجدید کر دی ہے جس کا اطلاق تھوڑی بہت ترمیم کے ساتھ متحرک اجسام پر بھی ہو جاتا ہے بلکہ انھوں نے مختلف طبعی مشاہدات اور ان سے اخذ شدہ متضاد نتائج کی تطبیق کے لئے ایک جدید نظریہ وضع کیا ہے جس کو وہ طبعی مظاہر سے کے متحدہ نظریے سے موسوم کرتے ہیں۔ اس نظریے کی رو سے انھوں نے نیوٹن کے کلیہ جذب ثقل کی طبیعات کے متداول اصولوں کے ماتحت توجیہ کرنے کے علاوہ نور کے نظریۂ امتداد کا جو سائنس حال کا شاید سب سے بڑا مختلف فیہ مسئلہ ہے ایک ایسا حل سوچا ہے جس کا گذشتہ دو صدیوں میں کوئی فیصلہ نہیں ہو سکا اور جس سے جملہ متضاد طبعی تجربات کی تطبیق ہو جاتی ہے۔

انشاء اللہ تعالے ہم کسی آئندہ فرصت میں اس اہم موضوع کے متعلق اپنے خیالات زیادہ تفصیل کے ساتھ پیش کر سکیں گے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

تنقید و تبصرہ

ا۔ مبلغ یہ دینی معلومات کا ایک مفید مجموعہ ہے جس کو ہر مہینے جناب محمد اسحٰق صاحب چنیوٹ امرتسر سے شائع کرتے ہیں قیمت سالانہ ۲ حجم عام تقطیع کے دو جزء۔ اس مرتبہ حج نمبر ہمارے سامنے ہے جسمیں حج مناسک حج اور سفر حج کے متعلق مفید معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ ملنے کا پتہ۔ مہتمم رسالہ مبلغ حقانی بکڈپو امرتسر۔

۲۔ بچوں کا تحفہ۔ حصہ اول و دوم، قیمت فی حصہ ۵ ر تصنیف محمد شفیع الدین صاحب نیر استاد ماڈرن اسکول نئی دہلی۔ یہ جناب نیر صاحب کی اُن آسان اور دلکش نظموں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً بچوں کے لئے ترتیب دیں۔ معلوم ہوتا ہے نیر صاحب کو بچوں کی نظمیں لکھنے میں خاص ملکہ حاصل ہے انکا یہ مجموعہ ملک میں مقبول ہوا اور اچھے اچھے ماہرین تعلیم نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ اکثر مدارس نے اس مجموعے کو طلبا کے مطالعہ کے لئے منظور کر لیا ہے طباعت کتابت نہایت دیدہ زیب ہے اور کہیں کہیں تصویریں بھی دی گئی ہیں۔ جناب مصنف سے ، رکوچہ تاراچند دہلی ، کے پتہ سے طلب کی جائے۔

۳۔ جوہر انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا رسالہ، قیمت ۸ ر انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ کی طرف سے ہر مہینے ایک قلمی رسالہ شائع ہوتا ہے جس کو اس مرتبہ یوم تاسیس کے موقعہ پر اراکین انجمن نے مطبوعہ شکل میں شائع کیا ہے پورا مجموعہ طلبا اور اساتذہ کے لکھے ہوئے اچھے اچھے مضامین پر مشتمل ہے۔

ملنے کا پتہ۔ انجمن اتحاد۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ، قرول باغ دہلی

۴۔ ساربان ایک ماہوار رسالہ زیر ادارت غلام محمد خاں صاحب بی۔اے۔ ساربان ایک ماہوار رسالہ ہے جو ۲۰×۳۰/۸ کی تقطیع پر دو تین مہینے سے جناب غلام محمد خاں بی۔اے کے زیر ادارت لاہور سے شائع ہو رہا ہے حجم تقریباً چار جزء۔ ساربان کا مقصد ہندوستان کے سیاسی معاشرتی اور اقتصادی معاملات پر آزادی کے ساتھ بحث کرنا ہے اور یہ دیکھکر خوشی ہوتی ہے کہ قابل مرتب نے اس غرض کے لئے ہر پرچے میں نہایت مفید اور دلکش مضامین جمع کر دیئے ہیں امید ہے وہ اپنی سیاسی معاشرتی اور اقتصادی تنقید کی کوئی صحیح اساس بہت جلد قائم کر سکینگے۔ صرف یہی ایک صورت ہو رائے عامہ کی تعلیم و تربیت کی سالانہ قیمت تین روپے فی پرچہ ۴ ر

ملنے کا پتہ دفتر رسالہ ساربان، آسٹریلیا بلڈنگ، لاہور

جہاں گزراں

رجال و مشاہیر

جلالت الملک سلطان ابن سعود

میں جلالت الملک کو بیس سال سے جانتا ہوں۔ ۱۹۱۷ء سے، جب میں انگریزی نمائندے کی حیثیت سے انکے دربار میں حاضر ہوا اس وقت وہ ریگزار عرب کے بہت بڑے حصے کے بادشاہ تھے مگر دنیا ان سے بہت کم شناسا تھی۔

اس وقت تک ان کی زندگی زیادہ تر جنگی مہموں میں بسر ہوئی جن کے لئے ان کا عظیم الہیکل جسم خاص طور سے موزوں واقع ہوا ہے لیکن میرے دل پر اسوقت بھی سلطان کی جنگی قابلیت کی بجائے ان کے حسن انتظام اور صلاحیت حکومت کا اثر ہوا کیس نکسی طرح انھوں نے سرکش اور غیر تربیت یافتہ عربوں کو ایک نہایت ہی مفید جنگی آلے میں تبدیل کر دیا تھا جو انکے اشارے پر جدھر چاہے حرکت کر سکتا تھا سلطان نے وقتاً فوقتاً اس آلے سے بہت سی کام لئے ہیں

حکومت کا سارا بوجھ سلطان کے کاندھوں پر ہے۔ وہ اسقدر مصروف آدمی ہیں کہ بعض وقت دن رات کے چوبیس گھنٹے بھی انکے مشاغل کے لئے کم معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا سارا دن امور سلطنت میں گذر جاتا ہے۔ دنیا میں کوئی بادشاہ نہیں جسکے دربار میں باریابی اس قدر آسان ہو انکے امرا انکے اردگرد چھوٹے چھوٹے تنچوں یا کرسیوں پر بیٹھے رہتے ہیں جلالت الملک کی نشست کسیقدر بلند ہوتی ہے اس طرح وہ سات بجے صبح سے دوپہر تک کام میں مصروف رہتے ہیں اور پھر تین بجے سے ۶ بجے اور آٹھ سے نصف شب تک امور حکومت کے علاوہ ان کا بہت سا وقت نماز میں صرف ہوتا ہے جس کے وہ سختی سے پابند ہیں۔ وہ ہر روز صبح دو گھنٹے عبادت اور دینی کتب کے مطالعہ میں گذارتے ہیں۔ آلعت انہیں کوئی مطلب نہیں۔ رات کو پانچ گھنٹوں سے زیادہ نہیں سوتے۔ ان کا کھانا لمبی لمبی کشتیوں میں پیش کیا جاتا ہے جس میں تمام حاضرین مجلس شریک ہوتے ہیں۔

شکار انکی ایک ہی تفریح ہے یا اپنے وقت کا نہایت قلیل حصہ جسے جلالت الملک گھر میں صرف کرتے ہیں۔ عرب میں عورتیں سختی کے ساتھ پردہ کرتی ہیں۔ لہذا سلطان کے گھر کی زندگی کا کچھ حال معلوم نہیں ہو سکتا۔ ہاں کبھی کبھی جب وہ امور سلطنت میں منہمک اپنے امرا و وزرا میں بیٹھے ہوتے ہیں تو کوئی ننھا سا بچہ دوڑتا ہوا ان کے پاس آ جاتا۔ اور

اپنے بڑے بھائی کی زیادتی کی شکایت کرتا ہو۔ اسوقت معلوم ہوتا ہے کہ جلالت الملک کے سینے میں کتنا بڑا دل ہے ان موقعوں پر تعجب ہوتا ہے کہ جس شخص کے لئے یہ ممکن نہیں کہ ایک چھوٹے سے بچہ کی بات کو ٹال سکے قدرت نے اس کو انسانوں کی قیادت اور خدا تعالیٰ کی بندگی کے لئے چن لیا ہے بیشک سلطان کے دل میں دو ہی باتیں ہیں رضائے الٰہی کی اطاعت اور ملت عربیہ کی عزت وناموس کی پاس داری۔ (سینٹ قلبی۔ بحوالہ السنر)

آغا محمد صفدر

۲۸-۲۹ نومبر یعنی جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب کو آغا محمد صفدر سیکرٹری بلدیہ لاہور کا دفعتہً انتقال ہو گیا اور جمعہ ہی کی شام کو ان کی میت ان کے خاندانی باغ میں سپرد خاک کردی گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آغا صاحب مرحوم سیالکوٹ کے رؤسا میں سے تھے۔ ان کی خاندانی وجاہت، اخلاق ودلنوازی اور سنجیدہ طبیعت کی ہر شخص دل سے قدر کرتا تھا۔ مسلمانان سیالکوٹ میں ان کا گھر ایک خاص شان رکھتا تھا۔ میں نے انکی محفلوں کے قصے بزرگوں کی زبانی سنے تھے۔ لیکن ان کو دیکھا اس وقت جب وہ اپنی مختصر ملازمت چھوڑ کر سیالکوٹ میں وکالت کر رہے تھے۔ دو ایک سال گذر گئے اور دفعتہً ملک میں تحریک "ہوم رول" کا چرچا شروع ہو گیا یہ ۱۹۱۸ء کا ذکر ہے۔ جب مسٹر مانٹیگو آنجہانی ہندوستان آئے ہیں۔ میں اس زمانے میں کالج میں پڑھتا تھا جہاں ہم مسلمان طلبا نے مرے کالج مسلم ایسوسی ایشن کے نام سے ایک انجمن قائم کر رکھی تھی۔ ایک شام کو اس انجمن کی طرف سے آغا صاحب کی خدمت میں درخواست کی گئی کہ وہ تحریک ہوم رول اور "نظر نہمان ہند" کے متعلق طلبا سے خطاب کریں۔ ہمارے انگریز پرنسپل کو اگرچہ یہ بات ناگوار گذری لیکن اس صحبت میں وہ بھی شریک ہوئے مجھے اچھی طرح سے یاد ہے آغا صاحب مرحوم سیاہ رنگ کا سوٹ پہنے تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی تھی اور یہ لباس انکے چوڑے چکلے مضبوط جسم اور سرخ وسپید افغانی چہرے پر نہایت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اس روز آغا صاحب نے کوئی دو گھنٹے تک مسلسل تقریر کی لیکن اس قدر مدلل، باموقعہ، سبق آموز اور مطالب ومعانی سے پر کہ ان کی متانت فکر، اصابت رائے، جچی تلی تنقید اور صحت بحث کی مسٹر گیرٹ (پرنسپل مرے کالج سیالکوٹ) کو بھی داد دینا پڑی۔ مستقبل کے سیاسی ہنگامے ابھی دور تھے مگر اس بات کو ہر کوئی جان گیا کہ آغا محمد صفدر ایک نہایت ہی بلند بصیرت، صاحب عزم، مخلص اور عالی نظر انسان ہیں اور اپنے سینے میں ایک حساس اور دردمند دل رکھتے ہیں۔ یہ گویا ان کی سیاسی زندگی کا آغاز تھا۔ تھوڑے دنوں میں جب تحریک ترک موالات کی ابتدا ہوئی تو وہ پورے جوش وخروش اور سرگرمی کے ساتھ اس میں شامل ہو گئے۔ اب تمام پنجاب میں انکی صفات عالیہ اور غیرت اسلامی کا شہرہ تھا۔

حسن اتفاق سے مجھے انہی دنوں یعنی ۱۹۲۱ء میں آغا صاحب کے ساتھ مجلس خلافت پنجاب کی طرف سے کام کرنے کا موقعہ ملا۔ اس وقت ان کا قیام زیادہ تر لاہور ہی میں رہتا تھا۔ مجھ سے ان کا سلوک خاص شفقت اور بزرگی کا تھا۔ شاید اس لئے کہ خاندانی مراسم کے علاوہ ان کی خدمت میں دیر سے نیاز حاصل تھا۔ بہرکیف یہ زمانہ تھا جب ان کے جوہر شرافت، بلندی اخلاق، متانت و سنجیدگی اور خوش طبعی کا ہر شخص قائل ہو گیا۔ تحریک ترک موالات اپنی خامیوں کے باوجود اصولاً جسقدر بلند اور اعلیٰ احساسات پر مبنی تھی۔ عملاً اور اخلاقاً اس کا درجہ اسیقدر پست اور کم رہا یہاں ان مکروہات کا تذکرہ اچھا معلوم نہیں ہوتا جو اس پر آشوب زمانے میں عام تھیں مختصر یہ کہ ہماری روزمرہ سیاست کے ذلت آمیز جھگڑوں اور ناقابل بیان بدعنوانیوں کو آغا صاحب نے بڑے صبر و تحمل سے برداشت کیا انکے سامنے آئے دن کوئی نہ کوئی فتنہ، کوئی نہ کوئی شاخسانہ اور گلوں اور شکایتوں کا دفتر کھلتا۔ مگر ان کی پیشانی پر بل نہیں آتا تھا۔ انکی شیرین کلامی، عفو و درگذر سلامت روی اور صلح جوئی کا دوست دشمن سب کو اعتراف تھا۔

دسمبر ۱۹۲۱ء میں مجھے جامعہ ملیہ کی دعوت پر علیگڈھ واپس جانا پڑا۔ کچھ دنوں بعد آغا صاحب بھی گرفتار ہو گئے۔ قید و بند کی سختیاں انھوں نے بڑے حوصلے اور صبر کے ساتھ برداشت کیں۔ ذیابیطس کا مرض انہیں بہت پہلے سے لاحق تھا۔ خیال یہ ہے کہ اس زمانے میں اس کی شدت اور بھی بڑھ گئی۔

چنانچہ پھر جو ان سے نیاز حاصل ہوا تو میں انکے زرد زرد چہرے اور نحیف و لاغر جسم کو دیکھکر حیران رہ گیا۔ تعجب ہوتا تھا یہ وہی آغا میرزا ہیں جن کے چہرے پر صحت اور تندرستی نثار ہوتی تھی۔ میں اپنے والد بزرگوار علیہ الرحمۃ جناب حافظ سید عبدالغنی صاحب کے ساتھ سیالکوٹ جا رہا تھا۔ لاہور ریلوے اسٹیشن پر ان سے ملاقات ہو گئی۔ یہ غالباً ۱۹۲۴ء کا ذکر ہے۔ ہم سب ایک ہی ڈبے میں بیٹھ گئے۔ علیک سلیک اور باہمی مزاج پرسی کے بعد والد ماجد نے تحریک ترک موالات کا قصہ چھیڑ دیا۔ ارباب سیاست کی خود غرضی، بچوں کی نافرمانی، ہندوؤں کا تعصب وغیرہ وغیرہ ... آغا صاحب مرحوم ہر ایک بات کو بڑی خندہ پیشانی سے سنتے تھے اور والد ماجد کی تسکین خاطر کے لئے اس وقت کے تمام سیاسی معائب کے متعلق کوئی نہ کوئی عذر بھی پیش کرتے جاتے تھے۔ ان کا دل اس وقت بھی اُمید اور کامرانی سے معمور تھا۔

بایں ہمہ تحریک ترک موالات کی ناکامی، ہندو مسلم منافشات اور خلافت اور کانگریس کے زوال کے ساتھ آغا صاحب نے سیاسی زندگی سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ان کا خیال تھا کہ اس وقت جب جہالت اور تعصب کی

گرم بازاری ہو عقلمندوں کا شیوہ ہے کہ عام ہنگامہ آرائی سے کنارہ کشی کریں۔ ہمارے انتہا پسند ارباب سیاست کو اگرچہ ان کی یہ روش پسند نہیں آئی لیکن بلدیہ لاہور کی سیکرٹری شپ قبول کرنے کے باوجود آغا مرزا کی زندگی کا جو انداز رہا ہے اس سے ہر شخص متاثر تھا۔ آغا صاحب کی وضعداری، خلوص نیت اور بے غرضی کی ہمیشہ تعریف کی جائے گی۔ میں اس زمانے میں جب کبھی لاہور گیا اور لاہور جانے کا بار بار اتفاق ہوتا تھا برابر انکا نیاز حاصل ہوتا رہا۔ وہ جب ملتے اسی بے تکلفی اور خلوص و محبت سے اور اگر فرصت ہوتی تو ملک کی سیاسی حالت پر دیر تک گفتگو رہتی۔ ان کے خیالات اگرچہ کم و بیش وہی تھے جن کے ماتحت انھوں نے اپنی سیاسی زندگی گذاری تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ ہندی قومیت اور وطنیت کے انحطاط اور بیرون ہند کے زبردست اجتماعی انقلابات بالخصوص ترکوں کے غیر معمولی تغیر سے انکی طبیعت متاثر ہوئے بغیر نہیں رہی۔ ایک طرف ان پر اشتراکیت کا غلبہ تھا اور دوسری جانب ان کے دینی خیالات تقریباً وہی رنگ اختیار کر چلے تھے جس کا اظہار ترکوں میں ہو رہا ہے۔ یہ غالباً ہندوستانی مولویت اور روایات پرستی کے خلاف ایک احتجاج تھا جس کو دیکھتے ہوئے امرتسر کی جماعت مسلمہ (اہل قرآن) نے ان کو اپنا خاص سرپرست تصور کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہاں آغا صاحب مرحوم کے خیالات کی صحت و عدم صحت سے بحث نہیں، مطلب یہ ہے کہ اسلام کی حقانیت پر انہیں پورا اعتماد تھا۔ یہ نہیں کہ وہ ملک کی اس عام رو میں بہ گئے ہوں جس پر الحاد اور بے دینی کا غلبہ ہے اور جس کو ہمارے بہت سے کور ذوق اور بے بصر مصلحین وسعت و رواداری اور روشن خیالی سے تعبیر کرتے ہیں۔

اگست ۱۹۳۵ء میں بالکل اتفاقی طور پر ان سے آخری ملاقات ہو گئی۔ ہم لوگ ماڈل ٹاؤن میں ایک ہی جگہ کھانے پر مدعو تھے۔ آغا صاحب مسٹر خورشید حسن قاضی حفیظ (جالندھری) اور بہت سے احباب اس شام کی صحبت کس قدر پر لطف تھی لیکن کون جانتا تھا کہ آغا مرزا کی زندگی کے اب بہت تھوڑے دن باقی ہیں۔ شروع خزاں میں وہ قاضی صاحب کے ہمراہ کشمیر تشریف لے گئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی سردی انھیں راست نہیں آئی۔ غالباً اثنائے سفر ہی میں ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ لاہور میں ان کا علاج جاری تھا کہ آخر نومبر میں دفعتہً ان کی حرکت قلب بند ہو گئی۔ سیالکوٹ میں جب یہ خبر پہنچی تو معلوم ہوتا تھا شہر پر ایک بجلی سی گر گئی ہے۔ یہ خیال نہیں تھا کہ ایک سیاسی کارکن اور قوم کا ہمدرد دنیا سے اٹھ گیا ہے۔ اس بات کا تذکرہ ضرور تھا لیکن رنج یہ تھا کہ ایک شفیق اور مہربان وجود جس سے

ہر شخص کو ذاتی اُنس تھا اب دنیا میں باقی نہیں رہا۔ انکی نماز جنازہ میں ہر طبقے اور ہر خیال کے لوگ بڑی کثرت سے شامل ہوئے۔ تدفین سے کسیقدر پہلے میں نے ان کا چہرہ دیکھا۔ اس وقت بھی اس پر ویسی ہی بشاشت اور مسکراہٹ نمودار تھی جیساکہ زندگی میں ان کا خاصہ تھا۔ بیگم آغا صفدر، ان کی اکلوتی بچی اور آغا غلام حیدر خاں صاحب رئیس سیالکوٹ سے یہ کہنے کی ضرورت ہی کہ آغا مرزا مرحوم مغفور کی بے وقت موت انکے احباب و شناسا اور بے شمار نیازمندوں کے لئے ایک ایسا جانگزا حادثہ ہے جس کو شاید وہ کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔

اللہ تعالیٰ انکی مغفرت کرے۔ آمین۔ (مدیر)

آثار و مقامات

اسکب

اسکب (Skolpje) جنوبی سلاؤنیا کا مشہور شہر جس کا ترکی اور اسلامی حصہ ایک پل کے ذریعہ اس کے نوتعمیر حصے سے جو دریائے وردر کے اُس پار واقع ہے ملحق ہے اور جس نے زمانہ قدیم سے کئی سلطنتوں کی تباہی اور بربادی کا منظر دیکھا، اسی اسکب کی اسلامی یادگاروں کے متعلق سوتھ سلاوت ہیرلڈ کی ایک اشاعت میں ایک صاحب ایل، ایف، ایڈورڈز لکھتے ہیں:۔

"اسکب میں کم از کم پچاس مسجدیں موجود ہونگی۔۔۔ مسجد عیسیٰ بیگ کا صحن کسی وقت گلاب کے پھولوں سے بھرا پڑا تھا۔ اس وقت نہ پھول ہیں نہ پھولوں کے تختے لیکن فواروں کی آب تاب اسی طرح باقی ہے۔ اب بھی صحن مسجد کے سایہ دار پیڑوں کے نیچے دو چار نمازی ادھر اُدھر بیٹھے نظر آجاتے ہیں۔ مسجد عیسے بیگ پندرہویں صدی میں تعمیر ہوئی تھی لیکن اسکا مینار اگرچہ نہایت خوبصورت اور نظر فریب ہے لیکن سب سے قدیم مینار ایک دوسری مسجد کا ہے۔ جامع سلطان مراد میں جو قالین بچھے ہیں وہ اس قدر عجیب و غریب ہیں کہ انکو دیکھکر آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ قدیم اسکب کی سب سے بڑی عمارت وہ سرائے ہے جو غالباً رومیوں کے عہد میں تعمیر ہوئی۔ ہمارا مطلب ہے "قرسلی خان" سے ترکوں کے زمانے میں یہ مقام تجارت کا مرکز تھا جہاں استنبول اور ؟ بلکہ عرب و ایران کے تاجر آیا کرتے تھے۔ قدیم اسکب کی تنگ اور پیچیدہ گلیوں اور اس کے لکڑی سے بنے ہوئے مکانوں اور دکانوں کا سلسلہ آج بھی دفعتہً کسی مسجد یا حمام کے صحن یا قبرستان کے پاس ختم ہوجاتا ہے۔۔۔"

تاریخ وسیاسیات

۱- عرب جدید

عرب میں انگریزوں کی حکمت کے متعلق سینٹ جان فلبی کا یہ مضمون غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ مدیر

تقریباً بیس سال ہوئے جب ہم نے پہلے پہل عرب کا نام سُنا تھا۔ اور اس ملک سے ہمارے طویل تعلق کا آغاز ہوا اس وقت بدقسمتی سے ہم کو وہاں کے متعلق بہت کم معلومات حاصل تھیں ہم اس ملک کے مسائل وحالات، اور اس کے مخصوص رسم و رواج اور تہذیب و تمدن سے بھی قطعی ناواقف تھے۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس حصہ کا عربی نام کیا ہے جسے ہم "میسوپوٹیمیا" کہتے ہیں۔ غرضیکہ اس ریگستانی سرزمین کا ہمیں بہت کم علم تھا لیکن ہم میں ایک شخص ایسا تھا جو عرب کو اچھی طرح سے جانتا تھا یعنی سرپرسی کاکس جو اس وقت عراق میں برطانوی افواج کے ساتھ پولیٹکل افسر تھے ان کی دوربین نگاہوں نے دیکھ لیا تھا کہ اگر شریف مکہ کو کسی نہ کسی طرح انگریزوں اور اتحادیوں کی امداد پر آمادہ کر لیا جائے تو ترکوں کا آسانی سے خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اُنہوں نے پہلا قدم بھی اُٹھایا تھا۔ کیپٹن شیکسپیئر کو فرمانروائے ریگستان کے پاس بھیجا گیا مگر بدقسمتی سے جنوری ۱۹۱۵ء میں کیپٹن شیکسپیئر ایک جھڑپ میں مارا گیا یہ جھڑپ دو عربی قبیلوں میں تھی جن میں سے ایک ہمارا حامی تھا اور دوسرا ترکوں کا۔ اس کے بعد چند وجوہات کی بنا پر سرپرسی کاکس اور حکومت برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ اس معاملہ کو ختم کر دیا جائے۔

چند سال کے بعد اس مسئلہ کو پھر چھیڑا گیا۔ اس وقت شریف حسین والئی مکہ تھا۔ اُس نے اعلان کیا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ جنگ میں شامل ہونے کے لئے تیار ہے مگر اس بات پر کہ شرائط پہلے سے طے کر لی جائیں۔ چنانچہ اس اعلان کے مطابق سرہنری میکموہن مصر کے برطانوی ہائی کمشنر نے شریف مکہ سے خط و کتابت شروع کر دی شرائط جو شریف حسین کے سامنے پیش کی گئیں یہ تھیں کہ فتح کے بعد انگریز ہمیشہ اپنے حلیف کی مدد کریں گے۔ عرب کو مکمل آزادی حاصل ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ عرب کی حدود بھی معین کر دی گئیں تھیں۔ یعنی پورا صحرا، فلسطین و شام اور عدن کو چھوڑ کر تمام ساحلی علاقے۔

نئے مسئلہ شروع تھی۔

شریف حسین نے یہ شرائط تسلیم کرلیں۔ اور ۱۹۱۶ء میں اس نے ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا۔ اس کے فوراً بعد کرنل لارنس ظاہر ہوا اور اس کی ان تھک کوششوں سے ترکوں کو شکست ہوئی۔

ایک طرف لارنس اور عرب ترکوں کے خلاف اپنے کام میں مصروف تھے۔ ان کے دل میں یہ خیال بھی نہیں تھا کہ اگر ایک جماعت اپنے وعدہ پر قائم نہ رہی تو کیا ہوگا۔ دوسری طرف انگریزوں نے روسیوں اور فرانسیسیوں سے ایک نئے مسئلہ پر گفتگو شروع کردی ان تینوں طاقتوں نے آپس میں یہ فیصلہ کیا کہ عرب کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے ایک انگریزوں کے لئے۔ دوسرا فرانسیسیوں کے لئے۔ اور تیسرا روسیوں کے لئے۔ حالانکہ معاہدہ کے مطابق یہ طے ہوا تھا کہ عرب شریف حسین کو دیا جائیگا۔ لیکن دوسرے سال ہی روسیوں نے یہ معاملہ طشت از بام کرکے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا جو عربوں کے لئے ایک زبردست سانحہ تھا مگر انگریزوں نے انہیں اطمینان دلایا کہ مضطرب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمام معاملات ٹھیک ہوجائیں گے۔ اسی سال یعنی ۱۹۱۷ء میں بالفور کا مشہور اعلان شائع ہوا جس میں فلسطین کو عرب سے الگ کیا گیا تھا۔ اس پر شاہ حسین نے برطانیہ سے جواب طلب کیا کہ ایسا اعلان کیوں کیا گیا ہے حکومت برطانیہ نے یقین دلایا کہ آخر میں سب باتوں کا فیصلہ ہوجائیگا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اس وقت پہلا کام یہ ہے کہ اپنے مشترکہ دشمن کا خاتمہ کیا جائے۔ عرب واقعی بالکل مضطرب نہیں ہوئے اور اپنے دشمن کا خاتمہ کردیا۔ اس کے بعد تمام معاملات پیرس کی صلح کانفرنس میں پیش ہوئے۔

لارنس اور فیصل دونوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی۔ ان دونوں کی جو پالیسی تھی اس کی حمایت حکومت برابر کررہی تھی یعنی یہ کہ انگریز تمام شرائط پورا کرنے کو تیار رہیں مگر فرانسیسی حکومت کے مطالبہ کی وجہ سے کچھ رد و بدل کرنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ انگریز ایک اور بھی تبدیلی چاہتے تھے شریف حسین جانتا تھا کہ اس کو ایک ایسی سلطنت مل رہی ہے جو اس کے لئے بہت کافی ہے مگر وہ اس معاہدہ پر دستخط کرنے کو تیار نہیں تھا کیونکہ اس کی رو سے فلسطین کی قسمت یہودیوں کے ہاتھ میں دے دی گئی تھی اس مسئلہ پر حکومت برطانیہ اور شریف حسین کے تعلقات بگڑ گئے اس کا نتیجہ شریف حسین کے زوال اور جلا وطنی میں نکلا۔

یہ حالات تھے جب لارنس اور فیصل آگے بڑھے۔ ان کے خیالات شریف حسین سے بالکل مختلف تھے۔ لارنس کی کوئی ذاتی خواہش اور تمنا نہیں تھی چونکہ وہ فیصل کا گہرا دوست تھا اس لئے اس کی مدد کرنا چاہتا تھا اور فیصل کے دل میں ایک آرزو تھی وہ تخت شاہی چاہتا تھا۔ ایک علاقہ حکومت کرنے کے لئے لارنس برابر اس کے لئے کوشش کرتا تھا۔ اور آخر کامیاب ہوا شام کا علاقہ فیصل کو اس شرط پر دیا گیا کہ وہ خود فرانسیسیوں سے جدید انتظامات کے متعلق

گفتگو کرے۔ اور یہ آسانی سے ہو بھی سکتا تھا کیونکہ وہ اس وقت پیرس میں موجود تھا مگر جب فیصل شام پہنچا تو اُسے معلوم ہوا کہ فرانسیسیوں سے مل کر کام کرنا ناممکن ہے ادھر فرانسیسیوں نے بھی سمجھ لیا کہ فیصل ایسا آدمی نہیں جسے کوئی ذمہ داری سپرد کی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے حکومت فرانس کے چند خریبی مطالبات تسلیم کرنے سے انکار کر دیا حکومت نے ان کو منوانے کے لئے اپنی فوجیں شام روانہ کر دیں۔ امیر فیصل وہاں سے بھاگ کر اٹلی جا پہنچا اور تمام حالات کی اطلاع لارنس کو دیدی۔

جنگ عظیم کے خاتمہ پر برطانیہ نے عراق کو شاہی نوآبادی بنا لیا تھا لیکن اس پر قبضہ کرنے کے بعد ہی عراقیوں نے بغاوت کر دی، امیر فیصل اور اس کے بھائیوں نے ان کی مالی امداد کی۔ اس بغاوت میں غالباً شریف حسین کا بھی حصہ تھا حکومت برطانیہ مجبور ہو گئی کہ وہ عراق کے مطالبات پر از سر نو غور کرے۔ لارنس نے جو عرب کے معاملات پر مسٹر ونسٹن چرچل کا مشیر تھا حکومت برطانیہ کو مشورہ دیا کہ تخت عراق فیصل کے حوالہ کیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اپنی موت تک فیصل عراق کے تخت پر قابض رہا۔

آپ کو تعجب ہوگا کہ میں نے ابھی تک ابن سعود کا ذکر نہیں کیا ہے۔ ان دنوں ابن سعود کو کوئی نہیں جانتا تھا کون کہہ سکتا تھا کہ یہ شخص عرب کی تاریخ میں انقلاب کر دیگا جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کیپٹن شکسپیر کی موت کے بعد حکومت برطانیہ نے عرب میں افسروں کا بھیجنا بند کر دیا تھا۔ لیکن اس کی موت کے ڈھائی سال بعد مجھے وہاں بھیجا گیا۔ عرب پہنچکر مجھے معلوم ہوا کہ رہنے کے لئے یہ ملک بہت محفوظ ہے۔ جب میں نے انگلستان پہونچکر یہ رائے ظاہر کی تو لوگ یقین نہیں کرتے تھے۔ اس دوران میں شریف حسین نے جو جنگ کے بعد بہت دل برداشتہ ہو گیا تھا اپنی توجہ وسط عرب کی طرف موڑ دی۔ جہاں ابن سعود اس کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کیلئے طیار بیٹھا تھا۔ ۱۹۱۹ء میں حالات نے نازک صورت اختیار کر لی۔ اراکین حکومت برطانیہ نے آپس میں مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ ان سے کہا گیا کہ ابن سعود کی طاقت بہت ہی کم ہے۔ اور شریف حسین کے پاس منظم فوجیں، بہت سا روپیہ اسلحہ جات اور بارود وغیرہ موجود ہے۔ یعنی ہر ایک ایسی چیز جس سے فتح حاصل کی جا سکتی ہے حکومت برطانیہ اس بات پر پشیمان بھی تھی کہ شریف حسین کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا ہے۔ چنانچہ ابن سعود کو لکھا گیا کہ وہ وسط عرب پر قبضہ کرنے کی کوشش نہ کرے کیونکہ یہ ہز ہائینس کی حکومت کے زیر اقتدار ہے شاہ حسین نے وسط عرب کی طرف اپنی فوجیں بڑھائیں۔ لیکن ایک ہی رات میں ان کو شکست فاش ہوئی۔

کچھ انتظار کے حکومت برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ ایک کانفرنس منعقد کی جائے۔ تاکہ دونوں حکمران کسی مناسب

فیصلہ پر پہنچ سکیں یہ کانفرنس کویت میں منعقد ہوئی اور دونوں جماعتوں کے نمائندوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ یہ خیال بہت اچھا تھا بشرطیکہ حکومت برطانیہ دونوں جماعتوں کو اجازت دیتی کہ وہ آپس میں گفتگو یا لڑائی سے فیصلہ کرلیں۔ اور خود اس میں کسی قسم کی مداخلت نہ کرتی۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور کانفرنس بالکل ناکام ختم ہوئی۔ اس کے بعد وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ستمبر ۱۹۲۴ء میں ابن سعود نے اپنی مہم باشندگان طائف کے قتل عام سے شروع کی۔ دوسرے مہینے وہ مکہ میں داخل ہوا اور ایک ہی سال میں بغیر کسی مخالفت کے بادشاہ حجاز تسلیم کر لیا گیا۔

حجاز کی فتح کے بعد ابن سعود کا وہ خواب پورا ہو گیا جو اس نے نوجوانی میں دیکھا تھا اور جب اس نے نصف درجن ساتھیوں کی امداد سے آدھی رات کو ریاض میں داخل ہو کر اپنے آباو اجداد کا کھویا ہوا تخت حاصل کیا تھا۔ ابن سعود نے ان علاقوں کے متعلق بالکل خاموشی اختیار کرلی جن پر برطانیہ اور فرانس متصرف تھے۔ مگر ایک مسئلہ ایسا تھا جس پر انگریز اور ابن سعود آج تک متفق نہیں ہو سکے۔ جب شریف حسین نے یہ دیکھا کہ وہابی افواج مکہ کے قریب آپہنچی ہیں تو وہ اپنی موٹر کار میں جھکڑ ایسا بھاگا کہ جدہ پہنچ کر دم لیا اور وہاں سے وہ ایک چھوٹی سی بندرگاہ عقبہ میں پناہ گزیں ہوا۔ عقبہ اس وقت یقیناً سلطنت حجاز کا ایک حصہ تھا۔ وہابی فوجوں نے اس کا تعاقب کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ حدود فلسطین کے قریب پہنچ جائیں گی۔ اس کے نتائج بلاشبہ بہت خراب ہوتے۔ لہذا بجائے اس کے کہ وہابیوں کو ان حصوں پر قبضہ کرنے دیا جاتا۔ انگریزوں نے عقبہ، معان اور جیفر پر قبضہ کر لیا۔ حالانکہ وہ اپنی غیر جانبداری کا اعلان کر چکے تھے۔ شمالی عرب میں یہی ایک علاقہ ہے جس پر ابن سعود اور حکومت برطانیہ میں اختلاف ہے۔

یہ بتانے کے بعد کہ ابن سعود نے حجاز پر کس طرح قبضہ کیا اب یہ سن لیجئے کہ اس نے یہاں کس طرح حکومت شروع کی۔ فتح حجاز کے فوراً بعد ہی ابن سعود کا تعلق دنیائے جدید سے شروع ہوا۔ اس وقت تک وہ صرف ایک ہی طاقت سے واقف تھا یعنی حکومت برطانیہ سے لیکن جدہ میں بہت سی حکومتوں کے قنصل موجود تھے۔ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ فتح کے بعد وہابی حج کو بند کر دیں گے اور تجارت کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں گی۔ لیکن معاملہ بالکل برعکس ہوا۔ ابن سعود ایک دانشمند انسان ہے اور گو اس کی زندگی صحرا میں بسر ہوئی۔ مگر وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ مطالعہ اور اخبارات پڑھنے میں صرف کرتا ہے اس لئے وہ دنیا کے حالات سے اچھی طرح واقف تھا۔ پہلا کام جو اس نے جدہ میں آکر کیا۔ اس کا اثر بہت اچھا ہوا۔ شریف حسین

کے نزدیک موٹر کار کا مصرف محض یہ تھا کہ بادشاہ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دے۔ لیکن عام لوگ اس کو استعمال نہ کر سکیں ابن سعود نے یہ تمام پابندیاں دور کر دیں۔ اور حاجیوں کے لئے موٹریں ایک مقام سے دوسرے مقام پر چلنے لگیں۔ اب کوئی مسافر اور حاجی راستہ کی شکایت نہیں کر سکتا۔

ابن سعود نے لاسلکی کو بھی بہت اہمیت دی ہے ملک کے ہر بڑے شہر میں یہ چیز موجود ہے لاسلکی کے ذریعے اُسے بہت پہلے خبریں مل جاتی ہیں اور وہ شورش اور فتنہ فساد کی حالت میں صحیح وقت پر صحیح جگہ پہنچ سکتا ہے لیکن موجودہ حکومت میں اس کی بہت زیادہ ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ امن وامان قائم رکھنے میں ابن سعود کا اثر ہی بہت کافی ہے ایک آدھ مرتبہ حکومت کے خلاف شورش ہوئی بھی تو اُس کو سختی سے دبا دیا گیا۔ اب کسی کو جرأت نہیں ہوتی کہ ایسی حرکت کر سکے۔

اب میں سیاسی حالت بیان کرتا ہوں۔ عرب اور برطانیہ کا باہمی تعلق اور سب ممالک سے کہیں زیادہ ہے سات آٹھ سال قبل برطانیہ یا کسی دوسرے ملک کے لئے عرب میں کوئی دلکشی نہیں تھی۔ مگر اب حالت اور ہے چند سال ہوئے دو باتوں کی وجہ سے عرب کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ دو باتیں کیا ہیں۔ ہوا اور تیل۔ اب حکومت برطانیہ کو ایسی حکمت عملی اختیار کرنی چاہیئے کہ سعودی حکومت سے اس کے دوستانہ تعلقات قائم رہیں۔

سب سے پہلے میں ہوا کو لیتا ہوں۔ جنگ عظیم کے بعد حکومت برطانیہ اور اتحادیوں کی حکومت نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ تمام قوموں کو آزاد دیکھنا چاہتی ہیں اور اُن کی یہ آرزو ہے کہ سب قومیں مل جل کر رہیں ان میں سے ایک ایرانی قوم بھی تھی خوش قسمتی سے اس وقت اس میں ایک ایسا قابل اور مدبر انسان موجود تھا جس نے اس موقعہ سے فائدہ اُٹھایا اور اپنے اثر و اقتدار سے ایران کو بالکل آزاد کر لیا۔ اس نے شروع ہی سے کسی یورپین حکومت کی مداخلت اپنی سلطنت میں گوارا نہیں کی۔ ابتدا ہی سے حکومت برطانیہ اور حکومت ایران کے درمیان امپیریل ایرویز کے متعلق جو مشرق کو جاتا ہے اختلاف پیدا ہو گیا۔ یہ راستہ کئی سو میل تک ایرانی علاقہ میں خلیج فارس کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے۔ پہلوی حکومت سے پہلے حکومت برطانیہ مزے سے اس راستہ کو استعمال کرتی تھی کیونکہ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں تھا رضا باشاہ نے اس راستے کے استعمال کرنے کے متعلق اپنی شرائط پیش کیں۔ لیکن امپیریل ایرویز نے ان شرائط کو قبول نہیں کیا۔ مجبوراً دوسرا راستہ تلاش کرنا پڑا اور اس کے لئے خلیج فارس کا عربی ساحل منتخب کیا گیا۔ اس ساحل کا بہت سا علاقہ ابن سعود کے زیر اقتدار ہے لیکن کچھ حصے مثلاً کویت، بحرین، عمان، وغیرہ انگریزوں کی حفاظت میں ہیں۔ اس لئے حکومت

برطانیہ نے ایسے مقامات پر ہوائی اسٹیشن بنائے ہیں جو ان کے قبضہ میں ہیں۔ اور سعودی علاقہ کو بالکل نہیں چھیڑا ہے لیکن حکومت برطانیہ کے لئے ایسی آسانیاں حاصل کرنا بہت ضروری ہے کہ بروقت ضرورت اس کے ہوائی جہاز سعودی علاقہ پر اتر سکیں۔ اس کا امکان ہر وقت رہتا ہے کہ ہوائی جہاز کا انجن خراب ہو جائے، اور انگریزی اسٹیشن تک پہنچنے سے قبل اسے سعودی علاقہ میں اُترنا پڑے۔ اگر ابن سعود سے اجازت حاصل نہیں کی گئی تو بدوی عرب اس کے پُرزے پُرزے کردینگے۔ انہیں کوئی الزام بھی نہیں دے سکتا بدوی جانتے ہیں کہ ابن سعود کی اجازت کے بغیر کوئی اجنبی وہاں نہیں آسکتا۔ میرا خیال ہے کہ اگر ہم مناسب طریقہ پر ابن سعود سے اجازت حاصل کرلیں تو ہمیں یہ اختیار بھی مل سکتا ہے۔

دوسری چیز تیل ہے۔ دس بارہ برس سے ماہرین کا خیال ہے کہ عرب میں تیل کے چشمے موجود ہیں۔ لیکن اس طرف کبھی توجہ نہیں کی گئی ۲۳-۱۹۲۲ء میں ابن سعود نے ایک انگریزی کمپنی کو ایک علاقہ میں تیل نکالنے کا ٹھیکہ دیا تھا۔ بدقسمتی سے اس کمپنی کے انتظامات مکمل نہیں تھے۔ اس لئے دو تین سال کے بعد یہ ٹھیکہ ختم ہوگیا۔ اس کمپنی کو جزیرہ بحرین کا بھی ٹھیکہ دیا گیا تھا لیکن جب باوجود کوشش بسیار وہاں تیل کے چشمے نہیں مل سکے تو اس کمپنی نے اپنا ٹھیکہ عراق کی اسٹینڈرڈ آئل کمپنی کو دیدیا۔ اور اس کمپنی نے معلوم کرلیا کہ اس علاقہ میں تیل موجود ہے۔ بس اس بات کا معلوم ہونا تھا کہ عرب کے حالات نے اور ہی صورت اختیار کرلی۔ اب امکان یہ ہے کہ بحرین کے نواح میں بھی یقیناً تیل موجود ہے دو سال ہوئے کیلیے فورنیا کمپنی تیل نکالنے کا ٹھیکہ لینا چاہتی تھی لیکن ایک دوسری کمپنی بھی میدان میں موجود تھی۔ جس کی پشت پر حکومت برطانیہ کا ہاتھ تھا بایں ہمہ ٹھیکہ کیلی فورنیا کمپنی کو دیا گیا۔ حکومت برطانیہ کیلئے یہ کوئی مسرت کی بات نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے عربی ساحل کے اردگرد جو ریاستیں تھیں ان سے اس بات کا معاہدہ کرلیا کہ وہ تیل کا ٹھیکہ صرف اس کمپنی کو دیں جسے حکومت برطانیہ منظور کرے۔

اب مشکل یہ ہے کہ ان علاقوں کی حدود کا کچھ پتہ نہیں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ یہ علاقے کہاں تک ہیں۔ اب تک اس کی کچھ ضرورت بھی نہیں تھی۔ ایک دو مرتبہ جب یہ کوشش بھی ہوئی کہ حدود متعین ہوجائیں تو اس میں ناکامی ہوئی ہوا اور تیل کے مسائل نے صورت کچھ نازک سی کردی ہے۔ ابن سعود اور حکومت برطانیہ کے درمیان ۱۹۲۷ء میں جو دوستانہ معاہدہ ہوا تھا وہ سات سال کے لئے تھا اور ستمبر ۱۹۳۲ء میں ختم ہوگیا۔ اب چھ مہینے کے لئے اسے اور زندہ رکھا گیا ہے۔

حکومت برطانیہ کو چاہیئے کہ عربوں کے جذبات کا خیال رکھے اور اس عہدنامہ پر عمل کرے جو ۱۹۱۵ء میں

شریف حسین اور اس کے درمیان ہوا تھا۔ اس وقت عدن کے سوا تمام علاقوں کو عرب میں شامل کر دیا تھا اگر اس وقت ہم نے شریف حسین کو یہ سب کچھ دینے کا وعدہ کر لیا تھا تو کیا وجہ ہے کہ ہم ابن سعود کو اس سے محروم رکھیں۔ جلالت الملک جس قدر دولتمند ہو جائیں گے اسیقدر ہمارے لئے فائدہ رہے گا۔

آخر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی وقت کوئی عالمگیر جنگ رونما ہو گئی تو ابن سعود کس کا ساتھ دے گا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں سے اُن کا اتحاد مشکل ہے۔ فرانسیسی دمشق اور شام پر قابض ہیں اور انگریزوں نے تحریک صہونیت کی طرف داری کے علاوہ فلسطین پر اپنا قبضہ جما رکھا ہے یہ دونوں باتیں ابن سعود کو پسند نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بلحاظ قوت ابن سعود کو ترکی سے کوئی نسبت نہیں۔ بقیہ صفحہ ۹۲ پر

۲۔ حبش

۱۔ حبش جدید — حبش ایک نہایت ہی قدیم ملک ہے۔ اشوا (نینوا) کے زمانہ عروج میں اہل حبش کی طاقت مسلم تھی۔ تاہوم (عہد نامہ عتیق کا ایک صحیفہ) میں اس کا ذکر موجود ہے۔ چوتھی صدی مسیحی میں یہاں عیسائیت کی ترویج ہوئی۔ اکسوم کا مشہور اور مقدس شہر قدیم حبش کا پایہ تخت ہے یہیں سے ارباط اور ابرہہ نے یمن پر اپنا قبضہ جمایا اور غالباً اسی مقام کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ مہاجرین اسلام کا پہلا ہجرت گاہ مقرر ہوا۔ سولھویں صدی میں سرزمین حبش مسلمان حملہ آوروں کے زیر اثر رہی۔ ۱۸۴۰ء میں امہارا کے زمانہ میں راس علی کی طاقت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ تمام حبش اس کے رحم پر تھا۔ معلوم ہوتا تھا نجاشی کی مسیحی حکومت ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیگی۔ دفعتہً کاسا کا ظہور ہوا جس نے آگے چلکر شہنشاہ تھیوڈور کا لقب اختیار کیا۔ تھیوڈور نے مسیحت کی حمایت کا بیڑا اُٹھایا وہ ایک نہایت ہی جنگجو اور سنگدل انسان تھا۔ جس کے ظلم و تعدی کا شروع شروع میں پتہ نہیں چلا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل حبش کو راس علی کی بڑھتی ہوئی قوت کا روکنا مقصود تھا۔ بالآخر ۱۸۵۶ء میں حبش کی اسلامی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اب تھیوڈور اندرونی اصلاحات کی طرف متوجہ ہوا اس کی کوشش یہ تھی کہ دول یورپ بالخصوص حکومت برطانیہ کے مشورے سے حبش کا نظم و نسق مغربی طرز عمل پر قائم کرے۔ لیکن یہ ایک الگ موضوع ہے جس کی تفصیل کا سردست موقعہ نہیں۔ مختصر یہ کہ مسیحت کا یہ حامی مغرب کی حکومتوں کی نظر میں ایک ”وحشی اور غیر مہذب“ انسان سے زیادہ وقعت حاصل نہ کر سکا۔ اس کی زندگی کے آخری آٹھ سال قتل و خونریزی، مسلسل جنگ اور غارتگری میں گذرے۔ آخر اس کا تصادم انگریزوں سے ہوا

۱۳ اپریل ۱۸۶۸ء کو جب انگریزی عساکر مگدالا میں داخل ہوئے ہیں تو ان کے سامنے سب سے پہلے تھیوڈور کی لاش تھی۔ جدید حبش کا بانی عزت کی موت کو ذلت کی زندگی سے بہتر سمجھتا تھا۔

۱۸۵۷ء میں جب تھیوڈور نے شوا کی اسلامی ریاست فتح کی ہے تو اس کے قیدیوں میں ایک بچہ بھی تھا یعنی مینلک، ادووا کا آئندہ فاتح۔ تھیوڈور نے اس کو بیٹوں کی طرح پالا اور آخر کار اپنی لڑکی سے اس کی شادی کر دی۔ یہ دو شخص جدید حبش کے بانی ہیں۔ تھیوڈور، فاتح اور جنگجو اور مینلک، حلیم اور صلح کا بندہ۔ ۲ نومبر ۱۹۳۰ء کو عدیس ابابا میں ایک بہت بڑا جشن منایا گیا تھا جس میں یورپ کے اکثر شہزادے اور مندوبین شریک ہوئے۔ یہ ہیلاسلاسی، نجاشی، شہنشاہ حبش کی تاج پوشی کا دن تھا۔ اسی روز ادووا کے مجسمے کی نقاب کشائی کی گئی۔

۲۔ ایک فیشطائی سلطنت ۔۔۔ آج کل اطالوی اخبارات میں ایک "فیشطائی سلطنت" کے الفاظ بار بار استعمال ہوتے ہیں۔ یہی بات تھی جو مسولینی نے افریقی عساکر کی روانگی کے وقت کہی۔ لہذا سوال یہ ہے کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے۔ اس کا جواب ایڈورڈ ہٹن نے نائنٹینتھ سنچری میں اس طرح دیا ہے:۔

۱۹۱۶ء میں جب اٹلی نے جنگ عظیم میں اتحادیوں کے ساتھ شرکت کی ہے تو اس وقت ایک اطالوی ہیڈیکٹر حکومت سائز راسو کی ایک کتاب شائع ہوئی جس میں اطالیہ کے حقوق ماورائے بحر پر بحث کی گئی تھی، یہ دیکھتے ہوئے کہ فرانس اور برطانیہ کا جرمنی کی نوآبادیات پر قابض ہونا یقینی ہے۔ راسو نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو اٹلی کے لئے کیا رہ جائیگا؟ راسو کہتا ہے کہ اٹلی کی نظر (۱) طرابلس میں مزید وسعت اور (۲) یمن پر ہونی چاہئے کیونکہ یمن عرب میں سب سے زیادہ شاداب اور سیر حاصل خطہ ہے اور یمن اور حبش کی قسمت صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ رہی ہے۔ لہذا یمن اور حبش دونوں پر اٹلی کا تصرف قائم ہونا چاہئے سیاسی اور معاشی خواہ اس کے لئے جنگ کی نوبت آئے۔ انگریز سواحل عرب، عراق اور خلیج فارس پر قابض ہیں۔ فرانس نے شام کو مضم کر لیا ہے اندریں حالات توازن قوت کا یہ تقاضا ہے کہ اٹلی کو حبش اور یمن کے معاملہ میں ہر قسم کی آزادی دیجائے۔ راسو کہتا ہے ۱۸۹۱ء میں برطانیہ اور اٹلی کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا تھا اس کی رو سے تمام حبش پر معہ تھیں تانہ اٹلی کا حق تسلیم کر لیا گیا تھا۔ لیکن ۱۸۹۶ء اور ۱۸۹۸ء میں دو زبردست واقعات پیش آئے۔ اول اٹلی کی شکست ادووا میں اور ثانیاً خرطوم کی فتح لارڈ کچنر کے ہاتھوں۔ اس کے بعد جو معاہدے ہوتے اس میں حبش کا حق خود مختاری برابر تسلیم ہوتا رہا۔ بایں ہمہ راسو کو دعویٰ ہے کہ حبش اٹلی کے حلقہ اثر میں شامل ہے بالخصوص اس کے مغربی، مشرقی اور جنوبی حصص یہ اس لئے کہ حبش کی تجارت کا رخ قدرتاً یمن کی جانب ہے۔ لہذا انگلستان اور فرانس دونوں کا

فرض ہے کہ حبش کے ساتھ بلاد سومال، خلیج عدن، بحیرۂ احمر اور باب المندب کو کلیتاً اٹلی کے لئے خالی کردیں۔

۳۔ **سائینر مسولینی سے ایک ملاقات** — ۱۴ ستمبر ۱۹۳۵ء کو جریدۂ "نائینٹنتھ سنچری" کے ایڈیٹر کو سائینر مسولینی سے "ایوان وینیشیا" میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ مسولینی نے کہا ... ہمارے نزدیک زندگی عبارت ہے جدوجہد سے۔ اٹلی میں سرمایہ داری کا خاتمہ ہوچکا ہے البتہ انفرادی کوششیں دن بدن ترقی پر ہیں۔ ہر شخص کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔ ہم مالی ذمہ داریوں کا اندازہ اس امر سے کرتے ہیں کہ قوم کا ان میں کیا حصہ ہے ... اٹلی کی زراعت بڑھ رہی ہے ... لیکن معاشی تغیرات اُسی وقت مفید ہوسکتے ہیں جب روح میں بھی کوئی صحیح تبدیلی پیدا ہو۔ اگر کسی شخص کو جوتے کا ایک فاضل جوڑا اور کسیقدر زیادہ مکھن ملنے لگے تو اس سے کوئی خاص نتیجہ مترتب نہیں ہو گا۔ بیشک اٹلی میں ایک ذہنی انقلاب رونما ہے ... جنگ عظیم کے بعد جو طاقتیں دولت عثمانیہ کے مختلف صوبوں اور جرمن نو آبادیات پر متصرف ہوگئی تھیں۔ ان کو چاہئے اب اٹلی کے راستے میں کوئی دشواری پیدا نہ کریں۔ حبش میں تیس لاکھ سامی آباد ہیں جنگ ان کا پیشہ ہے اور ان کا تمدن نو لاکھ نیگروؤں کی غلامی پر مبنی ہے ... افریقہ کا تاریک براعظم روشنی کا محتاج ہے۔ اٹلی نے مہدی کے معاملے میں انگریزوں سے یونہیں اشتراک عمل نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے انگریز اس حصے کی گذشتہ تاریخ کو بھول جائیں لیکن ہم ایسا نہیں کرسکتے ... حبش کے لئے انجمن اقوام میں کوئی جگہ نہیں الا یہ کہ وہ کسی مغربی طاقت کے قبضے میں ہو۔ مینلک اور اُس کے پیشروؤں کے مفتوح علاقے جنگجو قبائل سے آباد ہیں اور ان کا براہ راست اٹلی کے زیر انتظام آنا ضروری ہے ... ہمارا یورپ سے صرف ایک ہی مطالبہ ہے اور وہ یہ کہ جس طرح برطانیہ کو ہر بات میں آزادی دی گئی ہے۔ ہمیں بھی ایسا ہی اختیار دیا جائے۔ معاہدہ وارسائی توسیع فتوحات کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھا۔ مگر آخری ذریعہ نہیں۔ اب اٹلی کی باری ہے۔ یہ دیکھنا ہے کہ آیا اس نو آبادیاتی مسئلے کو یورپ میں جنگ وجدال کا سبب تو نہیں بنایا جاتا ... بہرکیف اٹلی کا حبش پر حق ہے ہم وہاں جو جی چاہے گا کرینگے ..."

میں اتوار کے روز چار بجے روما سے روانہ ہوا ... پیر کے دن ایطالوی کیبنٹ کے ایک وزیر نے دوران گفتگو میں کہا "اگر بعض طاقتوں کا یہ خیال ہے کہ وہ اپنے جغرافی، معاشی، مالی اور حربی ذرائع سے اٹلی کا گلا گھونٹ دیں تو پرواہ نہیں۔ ہم جانتے ہیں ہمارے پاس اس کا جواب کیا ہو گا۔ اگر یورپ نے ایسا کیا تو اسے یہ سودا بہت مہنگا پڑیگا ...

۴۔ **اگر جنگ ہوئی** — تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ رات کا وقت تھا۔ میں جبوتی سے اوپر ایک پہاڑی

"کافے" میں بیٹھا مسولینی کے ان الفاظ پر غور کر رہا تھا کہ حبش میں ہماری کامیابی یقینی ہے۔ ایک فرانسیسی کرنل نے مجھ سے کہا۔ "اگر قسمت نے گریزیانی کا ساتھ دیا تب بھی اس کی کامیابی دشوار ہے۔ ممکن ہے اس کا اصلی رُخ مصورع سے مگدالا کی جانب ہو۔ اگر ایسا ہے تو اریتیریا کے جنوبی گوشے سے بھی ایک دستہ حرکت کر سکتا ہے اور دوسرا اسمارہ سے حرار کی طرف... لیکن جنگ کا فیصلہ اس بات پر ہے کہ اہل اٹلی کا مقصد کیا ہے۔ پورے ملک کی فتح یا ایک حصہ کا قبضہ؟ اگر گریزیانی کی یہ خواہش ہوئی کہ اول معاشی اور حربی نقطہ نظر سے ایک ٹکڑے پر متصرف ہو جائے، تو یہ ذرا مشکل ہوگا۔ ۱۹۲۱ء میں جب اہل اسپین نے یہ کوشش کی ہے تو امیر عبدالکریم نے ان کا پورا توپ خانہ، ذخائر حرب اور بیس ہزار آدمی تباہ کر دیئے۔

میں نے کہا اہل اٹلی کبھی یہ غلطی نہیں کرینگے۔ کہ ایک ہی حملے میں سارے ملک پر قابض ہو جائیں۔ قدرتی رکاوٹیں بڑی زبردست ہیں۔ بے آب وگیاہ صحرا، اونچے اونچے پہاڑ۔

"بیشک اٹویپا کے مرتفع میدانوں کے سامنے بڑے بڑے ذہین سپہ سالاروں کی عقل بھی کام نہیں کرتی"

"گریزیانی کے طیاروں کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟"

"مراکش میں ہم ان کا تجربہ کر چکے ہیں۔ ان سے فائدہ کی بجائے الٹا نقصان ہوتا ہے۔" فرانسیسی کرنل نے جواب دیا۔ اور پھر مجھے سمجھانے لگا کہ فرانس کو اپنی ذمہ داریوں کا خوب علم تھا۔ اٹلی نے تو اس میدان میں ابھی قدم رکھا ہے۔ "ہم نے مراکش میں ہر قسم کے اسلحہ اور سامان جنگ استعمال کیا۔ لیکن ہمارے طریقہائے جنگ ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوئے۔ آخر میں ہم نے سو سو آدمیوں کی ٹولیاں بنا کر حریف کا مقابلہ کیا۔ تب کہیں کامیابی نصیب ہوئی۔"

فرانسیسی کرنل کی رائے تھی کہ حبش کی فتح مغرب الاقصےٰ سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ نجاشی اور اس کے فوجی سردار (رؤس) دس لاکھ بندوقچی میدان جنگ میں لا سکتے ہیں... ان کو اپنی گذشتہ کامیابیوں پر اعتماد ہے۔ ان کے داؤ پیچ عجیب ہیں... حبش کا ہر سپاہی مرنا جانتا ہے اور اس میں شہنشاہ سے لیکر معمولی سے معمولی آدمی تک سب کی حیثیت ایک سی ہے۔ نہایت چالاک اور بہادر لڑنے والے جنگ کا نتیجہ کیا ہوگا؟ "ایک بہت بڑا شاید۔"

یہ خیالات ہیں جو کرنٹ ہسٹری کی ایک اشاعت میں مسٹر فیئر ایک برطانوی مبصر نے ظاہر کئے ہیں۔ ایطالوی عساکر کی قیادت ایمیلوے بونو اور گریزیانی کے سپرد ہوئی ہے۔ گریزیانی بڑا آزمودہ کار سپاہی اور بہادر جرنیل ہے

جس نے مسلسل جنگ کے بعد اہل طرابلس کو اٹلی کی اطاعت پر مجبور کر دیا۔ دے بونو اریتیریا کا بانی کمشنر ہے اور فوجی نقل و حرکت کا انتظام، رسد، خبر رسانی، آمد و رفت، شفا خانوں اور اسلحہ وغیرہ کا بہم پہنچانا اسی کے ذمے ہے۔ افریقہ میں اٹلی کے بحری مرکز دو ہیں، مصوع اور منگا دلیشو۔ اول الذکر بحر احمر کے کنارے واقع ہے حدیدہ سے کسیقدر متصل۔ دوسرا اطالوی سومالستان کا بندرگاہ ہے۔ دونوں کا فاصلہ ۱۵۰۰ میل ہے اور دونوں روما سے کئی ہزار میل دور جہاں اطالوی حکام کو ہر قسم کا سامان جنگ اور ضروریات زندگی جمع کرنا پڑیں گی۔ جنگی اعتبار سے اٹلی کے یہ دونوں بندرگاہ نہایت معمولی مقامات ہیں۔ انکی آب و ہوا۔ محل۔ پیداوار کوئی چیز بھی قابل ذکر نہیں۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اٹلی کو یہاں ہر قسم کے شدائد اور تکلیفوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ بیماری دھوپ، گرمی کی تیزی، مصوع میں بھی ۱۲۵۰۰ آدمی بستے تھے۔ گرمیوں میں یہاں درجہ حرارت ۱۳۰ تک پہنچ جاتا ہے۔ تازہ اور صاف پانی نایاب، نہ یہاں پھول ہیں نہ چشمے نہ درختوں کے جھنڈ حالانکہ پاس ہی جبوتی میں یہ تمام نعمتیں موجود ہیں۔ بایں ہمہ اہل فرانس یا کسی یورپین کی یہ ہمت نہیں کہ اس "سفید شہر" میں دس قدم بھی چل سکے۔ بحیرۂ احمر کے سواحل پر آفتاب کی تمازت جس قدر شدید ہوتی ہے۔ اس کا مقابلہ کوئی شخص نہیں کر سکتا۔ اہل اٹلی اور بھی کم۔

۵۔ انجمن اقوام اور رفتار جنگ — حبش کی آزاد اور خود مختار ریاست وسطی افریقہ کے مشرق میں واقع ہے۔ اس کا کل رقبہ ۴ لاکھ مربع میل ہے۔ طبیعی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو سارا ملک دو مرتفع میدانوں پر مشتمل ہے۔ جن کے درمیان ایک نشیبی خط دریائے اواش، جھیل ریوڈلف اور ادیس ابابا کی جنوب مغربی جھیلوں کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے۔ فرانسیسی سومالستان جو علاقہ ملحق ہے یعنی دناقل وہ محض ریگستان ہے۔ اس ریگستان کے جنوبی کنارے کے ساتھ ساتھ جو ریل جبوتی سے عدیس ابابا کو گئی ہے۔ وہ فرانسیسیوں کی ملکیت ہے۔

اڈووا سے جھیل ریوڈلف تک شمال مغرب میں جو بلند میدان چلا گیا ہے اس کا ارتفاع اوسطاً ۵۰۰۰ فٹ ہے اور مشرق کی جانب سے ناقابل گذر۔ جنوب مشرقی سطح مرتفع اسکے برعکس ساحل کی طرف بتدریج پست ہوتی چلی گئی ہے۔ اس کی بلندی ۶۵۰۰ سے دس ہزار فٹ تک ہے اور اندرون ملک کی طرف سے اس میں آمد و رفت ناممکن۔ یہ میدان یوں بھی غیر آباد ہے سوائے اس کے کہ "چھوٹی برسات" کے زمانے میں یہاں چند خانہ بدوش جمع ہو جائیں۔ حبش کے تمام نشیبی علاقے استوائی ممالک کی طرح گرم ہیں۔ مرتفعات کی آب و ہوا

البتہ معتدل ہے۔ برسات کا آغاز جون سے ہوتا ہے اور بعض اوقات ستمبر میں بھی اس کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔

حبش کے ذرائع آمد و رفت نہایت محدود ہیں۔ ریل کی ایک سڑک کے علاوہ تقریباً ۵۰۰ میل لمبی سڑکوں پر سال بھر موٹر چل سکتا ہے۔ بعض نئی سڑکیں بھی تعمیر ہوئی ہیں۔ نئی سڑکیں جس قدر بھی ہیں اٹلی یا اٹلی کے روپے سے بنی ہیں۔

حبش کی باقاعدہ فوج ایک لاکھ آدمیوں پر مشتمل ہے۔ لیکن اس سال کے شروع میں حکومت کے پاس صرف ۵۰۰ اشین گن اور خود بخود چلنے والی رائفلیں موجود تھیں مختلف اقسام اور مختلف ناپ کی تقریباً ۲۰۰ توپیں اور کسی قدر ذخیرہ گولی بارود کا بھی ہوگا۔ چونکہ اسلحہ کی بہم رسانی برطانیہ، اٹلی اور فرانس کی مرضی پر منحصر تھی لہذا معلوم ہوتا ہے کہ اس لحاظ سے حبش کی حالت کچھ اچھی نہیں ملک میں بھی اسلحہ سازی کا کوئی کارخانہ موجود نہیں۔

جب کوئی فوج کسی ملک پر حملہ کرتی ہے تو اس کے سامنے ایک مقصد ہوتا ہے۔ دشمن کی فوج کو شکست دینا حصول تاوان کسی علاقے کا قبضہ وغیرہ وغیرہ۔ اٹلی کا مدعا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شمالی فوج اڈووا اور اکسوم کو فتح کرنے کے بعد تاکہ ۹۶ ۱۸ء کی ذلت کی تلافی ہو جائے جنوب کی طرف بڑھے اور اس طرح یا حسب مطلب شرائط صلح حاصل کر سکے یا جنوبی فوج سے ملجائے اٹلی کی جنوبی فوج کا مقصد یہ ہے کہ اس کا ایک دستہ دبشیلی اور دوسرا دب ماتا سے ہوتا ہوا دیرواوا اور حدامہ کی ریل پر قابض ہو کر شمالی عسکر سے جا ملے۔

جنگی لحاظ سے اٹلی یہ فوج کشی کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ حبش کا سب سے بڑا سامان مدافعت اگر کچھ ہے تو اس کے قدرتی موانع۔ اٹلی کا طریق جنگ بھی سیدھا سادا اور داؤ پیچ سے خالی ہے اول ہوائی تاخت اور گولہ باری، پھر دیسی لشکر کی پیشقدمی کہ اگر اس نے کسی مقام مقام پر قبضہ کر لیا تو وہیں رہ کر دشمن سے اطاعت کا عہد لے۔ اس اثنا میں اطالوی فوج آگے بڑھکر پورے رقبے کے استحکام کی تدبیر کرتی ہے یعنی سڑکوں اور ذخائر آب کی طیاری، اشتہار و اعلان۔ یہ طریق اگرچہ سست ہے مگر کامیاب چونکہ حبش میں سڑکیں موجود نہیں اور حبشی افواج صرف پاپیادہ یا گھوڑے پر حرکت کر سکتی ہیں۔ لہذا اٹلی کے لئے راستوں کی حفاظت ایک معمولی سی بات ہے۔ چند مسلح کارین اہم مقامات کی نگرانی کے لئے کافی ہونگی۔

جنگ کی باقاعدہ ابتدا غالباً ۲۵ ستمبر کو ہوئی جب اطالوی فوجوں نے ایدغرات کی شمالی سرحد کو عبور کیا ۴ اکتوبر کو انھوں نے دریائے مارب سے اڈووا اکسوم اور ایدغرات کی طرف پیش قدمی کی ابتدا کی اسکے ساتھ ساتھ اطالوی طیارے حرار اور اوالال کے شمال تک گولہ باری کرتے چلے گئے تاکہ حبشی افواج کہیں

جمع نہ ہو سکیں۔ ۶ اکتوبر کو اڈوا اور اید غرات فتح ہوئے۔ اکسوم ۱۱ اکتوبر کو اور ماکلے ۸ نومبر کو۔ ادھر جنوبی لشکر ۱۰ نومبر تک وسطی حبش میں داغر بور پہنچ گیا اور ہرار کی طرف پیشقدمی شروع ہوئی۔ ۶، دسمبر کو دسئی پر بمباری کی گئی۔

اس اثنا میں انجمن اقوام اور بین الاقوامی دنیا بھی خاموش نہیں رہی۔ ۷، اکتوبر کو انجمن کی کونسل نے متفقہ طور پر یہ رائے قائم کی کہ حکومت اٹلی نے میثاق انجمن کی دفعہ ۱۲ کی خلاف ورزی کی ہے لہٰذا اس پر خود بخود دفعہ ۱۶ (یعنی تعزیرات) کا اطلاق ہو جائے گا۔ اس کے دو روز بعد اراکین انجمن نے باستثنائے آسٹریا اور ہنگری کونسل کی رائے سے اتفاق ظاہر کیا۔ تعزیرات کے سلسلے میں اول یہ طے کیا گیا کہ اٹلی کو نہ کوئی حکومت قرضہ دے نہ اس سے ساکھ رکھے۔ پھر قرارداد ۳، ۴، ۵ کے ماتحت اٹلی کی تمام برآمد اور بعض خام اشیاء کی درآمد پر روک عائد کرنے کی تجویز منظور کی گئی۔ اب یہ فیصلہ ٹھیرا کہ تعزیرات کا اطلاق ۱۸، نومبر سے ہو۔ ان تجاویز سے بعض حکومتوں نے جزوی طور پر اختلاف کیا۔ بایں ہمہ انگلستان اور فرانس کو اخلاقاً اس بات کا حق دیا گیا کہ وہ مصالحت کی کوشش جاری رکھیں۔ ۶، نومبر کو کناڈا کی یہ تجویز بھی منظور کر لی گئی کہ اگر ضرورت پیش آئے تو تیل، لوہے، فولاد، کوئلے وغیرہ کے متعلق بھی امتناعی احکام صادر کر دیئے جائیں۔ اس تعزیر کے استعمال کا ابھی وقت نہیں آیا اگرچہ پچھلے دنوں صدر روزولٹ کی ایک تقریر سے یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ شاید اس کا اطلاق قریب ہے۔ بہر کیف اٹلی اور حبش کے نزاع میں سب سے زیادہ دلچسپی انگلستان اور فرانس کو ہے۔ اس معاملہ میں دونوں حکومتیں پورے اتفاق رائے سے کام کر رہی ہیں۔ اکتوبر ہی میں فرانس نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ اگر اٹلی نے بحیرہ متوسط میں انگریزی بیڑے پر حملہ کیا تو فرانس انگلستان کے ساتھ ہوگا۔ انجمن کی طرف سے مصالحت کے لئے "اخلاقی انتداب" بھی ان دونوں حکومتوں کو حاصل ہے۔ ۸، دسمبر کو سر سیموئیل ہور اور موسیو لاوال نے صلح کی چند شرائط مرتب کیں جنکو اٹلی یا حبش نے تو منظور نہیں کیا لیکن جنکی بنا پر سر سیموئیل ہور کو اپنے عہدہ سے مستعفی ہونا پڑا۔ موسیو لاوال کے متعلق بھی یہی خطرہ تھا مگر ۲۸، دسمبر کو فرانسیسی ایوان نے انکی ذات میں اظہار اعتماد کی قرارداد منظور کی۔ سر سیموئیل ہور کے جانشین مسٹر ایڈن ہوئے ہیں جنکے تقرر کو روما میں کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ یوں بھی رفتہ رفتہ اٹلی کے خلاف ناراضگی کا جذبہ بڑھ رہا ہے۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد بین الاقوامی دنیا سچ مچ اس کی مخالف ہو جائے۔ ادھر جنگ کے حالات بھی کچھ قابل اطمینان نہیں۔ شروع شروع کی پیشقدمی کے بعد اب اٹلی کو ایک طرف قدرتی موانع اور دوسری جانب حبشی حملوں کا مقابلہ کرنا ہے۔ سردست خبروں کی رفتار یہ ہے کہ حبشی افواج نہایت کامیابی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اٹلی کا نقصان جنگ دن بدن بڑھ رہا ہے اور بہت ممکن ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں مفتوحہ مقامات پر قبضہ رکھنا اس کے لئے مشکل ہو جائے۔

(کرنٹ ہسٹری۔ اسٹیٹسمین)

(بقیہ صفحہ ۸۵)

بایں ہمہ مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم عرب کے متعلق اپنی حکمتِ عملی میں کوئی مناسب تبدیلی پیدا کریں۔

۱۔ جاپانی محکمۂ اطلاعات

یول وار سینٹ محل کے اس خاموش چینی رستوران میں جہاں معزز جاپانی کھانے کے بعد اکثر جمع ہو جایا کرتے ہیں کمانڈر ایروک تچی گی (نام اور خطاب دونوں کی کوئی اصلیت نہیں) نے اپنے بعض دوستوں کو مدعو کر رکھا تھا۔ تقریب یہ تھی کہ جون ۱۹۳۵ء میں جاپان نے بغیر کسی قتل و خونریزی کے شمالی چین کے دو صوبوں ہوپی اور چاہار پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس فتح کی خوشی میں کوئی جشن منانا چاہیے۔ اتفاق سے اس محفل میں مجھے بھی شریک ہونے کا موقعہ مل گیا۔ اس قسم کی صحبتوں میں وسکی ہمیشہ پانی کی طرح پی جاتی ہے۔ شراب کا دور گرم ہوا تو کمانڈر نے جو اس بات سے مطمئن تھا کہ سارے رستوران میں جاپانی سمجھنے والا کوئی بھی نہیں اپنی تقریر شروع کی

"حضرات یہ ٹوسٹ ہے جاپانی کوانگ ٹنگ عساکر کے اعزاز میں ان عساکر نے حال ہی میں تین کروڑ باشندوں کو جاپانی نو آبادیات میں شامل کر لیا ہے اور باقی پانچ کروڑ آبادی کو بھی اس عظیم الشان سلطنت میں شریک کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وسعت حدود کے لیے جو پروگرام طیار کیا گیا تھا اس کا پہلا جز نہایت کامیابی سے پورا ہوا ہے۔ حضرات! آپ کو ۱۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کی وہ رات ابھی تک یاد ہوگی جب لفٹیننٹ کاواموٹو نے مکدن سے کسیقدر شمالی سمت میں ایک خوفناک دھماکے کی آواز سنی تھی۔ اس کے ساتھ صرف چھ آدمی تھے اور غالباً ۱۰ بجے کا وقت تھا لیکن چند ہی لمحوں میں منچوری اور کوریائی افواج پورٹ آرتھر تک مصروف پیکار تھیں۔ اگر آپ بھولے نہیں تو جنگ کا آغاز دھماکے کی آواز سے ٹھیک ۳۲ سیکنڈ بعد ہوا تھا۔ اہل چین کو تعجب ہے کہ ہم نے سات روز کے قلیل عرصہ میں منچوریا کو کیونکر فتح کر لیا۔ وہ کہتے ہیں ہمیں حقوق انسانی کا مطلق پاس نہیں ہم نے کیلوگ برایاں پیکٹ، معاہدہ واشنگٹن اور میثاق انجمن اقوام کی خلاف ورزی کی ان کے یہ احتجاجات کس قدر مضحکہ خیز ہیں۔ شاید انھیں فطرت کے اس اٹل قانون سے کوئی واقفیت نہیں کہ شیر ہمیشہ بھیڑ بکری کو نگل جایا کرتا ہے۔ بہر کیف جس روز واقعہ ہوا ہم نے اسی دن جنیوا اور اس کی ساری منافقتوں کو خیر باد کہہ دیا۔ البتہ صوبہ جیہول جیسا کہ آپ کو خوب علم ہے منچوریا سے وابستہ ہے۔ اسے ہم چینیوں کے ہاتھوں میں کیسے چھوڑ سکتے تھے۔

۱۹۳۴ء کے آغاز ہی میں ہم نے اس کا الحاق ایک ،، آئینی ،، حق کی بنا پر اپنی شاندار سلطنت سے کرلیا۔ اہل جیہول اس عزت افزائی کے لئے ہمیشہ جاپان کے ممنون رہیں گے۔

حضرات! یہ صورت ہے منچوکوکی ماتحت ریاست کے وجود میں آنے کی۔اب توسیع سلطنت کا مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ہم نے جو لائحہ عمل تیار کر رکھا تھا اسکی تکمیل کیلئے دو برس کی طویل مدت کی ضرورت تھی۔ہم چاہتے تھے کہ بالکل دوستانہ طریق پر ہوپی، شان تنگ، شانسی، علیٰ ہذا چاہار اور سوئی ین کے منگولی صوبوں تک پہنچ سکیں۔قسمت ہمارے ساتھ تھی۔ پیرس اور لندن میں ہمارے تنخواہ دار (ہم بڑی بڑی تنخواہیں دیا کرتے تھے) داعی نہایت زور و شور سے پراپیگنڈا کر رہے تھے۔ انھوں نے اہل برطانیہ سے یہ کہا کہ منچوریا میں حصول زر کے ذرائع نہایت وسیع ہیں (یہ نہیں کہا کس کے لئے) اور اہل فرانس سے یہ کہ تیل کے معاملے میں انگریزوں نے آپکا ہمیشہ دق کیا ہے۔یہ خفیہ ریشہ دوانیاں پچھلے اکتوبر میں شروع ہوئیں یورپ کی رائے عامہ کا تو ہمیں مطلق خیال تھا نہیں۔اب ہماری کارروائیوں کے دوسرے حصے کی تکمیل کا موقعہ تھا۔آپ کو معلوم ہے جون ۱۹۳۵ء میں یہ تماشا بھی ختم ہوگیا۔

حضرات! میں آپ سے یہ بھی عرض کردوں کہ اشتراک عمل کے باوجود کوانگ تنگ کا محکمہ اطلاعات ایک آزاد نظام ہے جسے تبت اور بیرون منگولیا میں انگریزوں اور روسیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔یہ موقعہ تفصیلات کا نہیں چین میں ہمارے آدمی ہر جگہ مصروف کار ہیں کیونکہ تمام چین کوانگ تنگ کی سرگرمیوں میں شامل ہے۔

آیئے حضرات اب ہم سب ملکر کوانگ تنگ عساکر کے محکمہ اطلاعات کی عظیم الشان کامرانیوں پر ایک ایک جام نوش کریں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس وقت ایک مختصر سا قصہ آپ کے سامنے بیان کردوں۔مغربی چین کے ایک ،، نیم مغربی ،، ریسٹوران میں تین سوداگر جمع تھے۔ایک انگریز، ایک جاپانی، اور ایک روسی۔انگریز فوٹوگرافی کا کام کرتا تھا۔ جاپانی کہتا تھا کہ وہ مقوی ادویات کی تجارت کرتا ہے اور روسی ،، فر ،، کی۔ رفتہ رفتہ انکی میل ملاقات بڑھنے لگی۔ وہ اکثر ایک دوسرے کی صحبت میں شریک ہوتے اور وسکی سے اپنا دل بہلاتے۔ایک روز انگریز نے سوچا جاپانی کے لئے غالبًا چھ گلاس کافی ہونگے۔لیکن سوال یہ ہے کہ روسی پر سولھویں گلاس کا اثر بھی ہوگا یا نہیں یا پھر مجھ کو بیس گلاس پینا ہونگے۔آخر ایک موقعہ پر شراب کا دور شروع ہوا جینی چھوکرا جام پر جام لنڈھا رہا تھا۔تھوڑی دیر میں صحبت گرم ہوگئی اور تینوں دوست کھل کھل کر باتیں کرنے لگے لیکن انگریز کی نظر برابر جاپانی پر تھی۔اس نے چھٹا گلاس بھی پی لیا تو انگریز کے تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہی اور روسی کا تو کچھ پوچھئے

نہیں۔معلوم ہوتا تھا اس کے سامنے وسکی نہیں پانی ہے۔آخر کار جب بارہویں گلاس کی نوبت آئی۔ تو تینوں دوستوں نے دفعتہً محسوس کیا کہ ان پر نیند کا غلبہ ہے انھوں نے لاکھ کوشش کی کہ کسی طرح اس کا مقابلہ کریں مگر بے سود۔تھوڑی ہی دیر میں انکی آنکھیں بند تھیں۔

حضرات! اس کے بعد ــ بارہ گھنٹوں کے بعد ــ جب انکی آنکھ کھلی اور وہ اپنی اپنی جائے قیام پر واپس گئے ہیں تو انگریز نے دیکھا کہ اس کی میز پر ایک لفافہ رکھا ہے جس میں کئی پونڈ اسٹرلنگ موجود ہیں گویا اس کی تصاویر کی قیمت تھی کیونکہ اس کی فوٹو گرافی کا کوئی نمونہ کمرے پر موجود نہیں تھا۔اس پر انگریز نے صرف اتنا کہا "دہ ڈیم" لیکن روسی کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔اس کے ہاں سے سمور کے بعض ایسے ٹکڑے جن میں نہایت بیش قیمت استر لگا تھا اور جو اصل میں خفیہ جیبوں کا کام دیتے تھے غائب تھے۔روسی کو اپنی جان کا خطرہ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اسے جو معاوضہ دیا گیا نہایت معقول تھا یعنی متعدد روبل۔یہی کیفیت جاپانی کی تھی۔اس نے اپنے مرتبانوں میں مقویات کے سفوف کے اندر جو تحریریں چھپا رکھی تھیں ان کا اب کہیں پتہ بھی نہیں تھا۔ہاں اس کے بدلے ینوں (جاپانی سکہ) کی ایک رقم موجود تھی۔رہا چینی چھوکرا جس نے شراب پلائی تھی۔اس کے متعلق یہ معلوم ہوا کہ وہ صبح ہی ہوٹل سے چلا گیا ہے کیونکہ اسے اپنے باپ کی اچانک بیماری کا تار آگیا تھا۔لیکن اس واقع کے دو مہینے بعد جب جاپانی اور یہ فردش ہن کن واپس آیا ہے جہاں تمام کوانگ تنگ عساکر جمع تھے تو اس کے سردار نے اس سے جس انداز میں گفتگو کی ہے وہ اسے کچھ پسند نہیں آیا۔ بہر حال اس نے اپنی کارگزاریوں کی تمام روداد بیان کی لیکن جب اس کے افسر نے مقویات کے پانچوں مرتبان اس کے سامنے رکھ دیئے ہیں تو اس کے تعجب کی کوئی انتہا نہیں تھی۔اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ چینی چھوکرا ہن کن ہی کا ایک رکن ہے۔

حضرات! لوگ برطانوی محکمۂ اطلاعات کی تعریف کرتے ہیں۔لیکن میں نے جو حکایت آپ کے سامنے بیان کی ہے اسکے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔اہل جاپان کو مشرق اقصیٰ میں جو سہولتیں ہیں وہ کسی دوسری قوم کو میسر نہیں ہمارے یہاں نسل کا فرق تو ہے نہیں۔زبان اور طرز تحریر کا مسئلہ البتہ ذرا ٹیڑھا ہے جس کی طرف ہم خاص توجہ کر رہے ہیں۔ہمارے خبر رساں سنگاپور اور ملاکا سے لیکر تمام جزائر شرق الہند، چین اور ایشیا کے ہر اس ملک میں پھیلے ہوئے ہیں جہاں تھوڑے بہت چینی آباد ہیں۔جاپانی جو اسمیں اگرچہ پیشہ ور ملازم ہیں لیکن اب کچھ دنوں سے ہم نے بدھ بھکشوؤں سے بھی کام لینا شروع کر دیا ہے چینی زبان اور چینی تہذیب کا انہیں خوب علم ہے۔ پھر مذہبی معلومات کی بنا پر ان کا وجود ہمارے لئے نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔محکمۂ اطلاعات کے اعلیٰ افسر خبر رسانی کا کام

نہیں کرتے۔ یہ خدمت معمولی کارندوں کے سپرد ہے۔ افسروں کو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ وہ کس کس کا ضمیر خرید سکتے ہیں۔ ایسی مہموں میں کبھی کبھی میجر ڈوئی ہارا (ان کا سردار اعلیٰ) بھی ان کا شریک ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کو بعض "واقعات" پیدا کرنے پڑتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں ہم نے اکثر بعض حملہ آوروں کو اکسایا ہے تاکہ جاپان کو مداخلت کا موقعہ مل سکے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بولشویک قزاق جاپانی مصالح کا خیال کئے بغیر سرحدوں پر حملہ کر دیا کرتے ہیں۔ حضرات! اس کے لئے بعض دفعہ ہمارے افسروں کو اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے مگر وہ جو کچھ کرتے ہیں خوشی سے کرتے ہیں۔ آپ نے کپتان شتارونا کامورا کا واقعہ سنا ہے!۔ سنئے۔

کپتان ناکامورا ایک جاپانی افسر تھا ہاربن میں جب چینی حکام نے اس سے پاسپورٹ طلب کیا تو اس نے بیان کیا کہ وہ زرعیات کا ماہر ہے۔ چینی حکام نے اسے بتلایا کہ جس علاقے میں وہ سفر کرنا چاہتا ہے وہاں قزاقوں کا زور ہے اور یہ بات اس کے پاس پورٹ پر لکھ دی (رپورٹ لٹن کمیشن ص ۱۹) ۹؍جون کو کپتان ناکامورا ریل میں سوار ہوا اور ۲۷؍جون کو کسی نامعلوم ہاتھ نے اسے قتل کر دیا۔ یوں منچوریا کی فتح شروع ہوئی۔

۲۱ مئی ۱۹۲۲ء کو نائب امیر البحر اِماموراؔ نے محکمہ اطلاعات کے ایک خفیہ اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ "ہم چین کے خلاف ایک سیاسی مہم شروع کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ کیونکہ جاپان تجارتی اعتبار سے بھی چین کو اپنا غلام بنانا چاہتا ہے۔ اس کے لئے چین کا سیاسی قبضہ ضروری ہے۔ اس کے لئے جاپان نے کوانگ تنگ عساکر کے صیغۂ اطلاعات کو جس نہج پر ڈال رکھا ہے وہ نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ جاپانی ایک ایک کر کے چین کے تمام صوبوں پر متصرف ہونا چاہتے ہیں۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۳۴ء کو فلیبڈیلفیا ایونگ بلیٹن میں یہ عبارت شائع ہوئی تھی۔ "اگر ہماری یہ رائے ہوئی کہ مشرق اقصیٰ کے امن و امان کے لئے شمالی چین کا قبضہ ضروری ہے تو ہمیں اس میں مطلق تامل نہیں ہوگا۔ ہمیں اس بات کی فکر نہیں کہ دول یورپ اس کے متعلق کیا طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ جاپان اپنی روش پر قائم رہے گا خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔۔۔"

۲۔ روس کا جمہوری تغیر

از لوئی فشر

مسٹر فشر نے ذیل کے مضمون میں روس کے باطنی انقلاب پر جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بالشویک نظام میں ایک زبردست تغیر ہو رہا ہے۔ امید ہے قارئین اس کا مطالعہ دلچسپی سے کریں گے۔ — مدیر

بالشویک دنیا میں کوئی چیز مستقل نہیں۔ یہاں جو کچھ ہے مسلسل تغیر۔ اس وقت سوویٹ حکومت ایک مخصوص طبقے کے اختیار کلی پر قائم ہے جس نے ہمیشہ تخویف اور دہشت انگیزی سے کام لیا ہے بایں ہمہ اس نظام حکومت میں بھی تغیر و انقلاب کے آثار نمایاں ہیں۔ روس کی اشتراکی آمریت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے اور جس روز اس نے ایک جمہوریت کی شکل اختیار کر لی تو اس پر ہر شخص کو تعجب ہوگا۔ البتہ اس عمل کی صحیح نوعیت کو سمجھ لینا چاہیے ۳۲-۱۹۲۹ء میں جب پہلی پنج سالہ تجویز کی ابتدا ہوئی ہے تو اس کا اثر روس کے تمام باشندوں پر ہوا۔ بولشویک کہتے تھے روس کی صنعت اور دولت میں اضافہ ہو رہا ہے اس کے لئے لاکھوں کروڑوں روپے کی ضرورت ہوگی۔ ہمارا فرض ہے کہ اپنی آسائشوں کو ایک حد تک کم کردیں۔ اس وقت بہت سے لوگ اس بات کا مطلب نہیں سمجھے ان کو رہ رہ کر اپنی تکالیف و شدائد کا خیال آتا تھا لیکن آج ہر شخص کو اعتراف ہے کہ بالشویکوں کا دعویٰ غلط نہیں تھا۔ روس کے موجودہ نظام حکومت میں سب سے سربرآوردہ فریق مزدوروں کا ہے۔ ان کو متوسط الحال جماعت کے رہے سہے عنصر اور کسانوں سے زیادہ حقوق حاصل ہیں گویا روسی آمریت کی بنا امتیازات پر ہے۔ اس کا سارا دارومدار مزدور طبقے پر ہے لیکن حکومت کی عملی ذمہ داری اس جماعت کے خاص خاص اراکین پر ہے۔ اشتمالی (کمیونسٹ) فریق کی ترکیب انھیں اور ان کے اہل علم رفقا سے ہوئی ہے۔ تمام روسی عہدیدار اس فریق میں شامل ہیں۔ اور اشالین ان کا رہنما۔ لیکن اس فریق کی رکنیت کوئی معمولی بات نہیں اس کے امیدواروں کو بڑی بڑی آزمائشوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس جماعت کی ہیئت ترکیبی کا انحصار بھی چند مخصوص امتیازات پر ہے۔ ملک کے اصلی حاکم صرف مزدور ہیں اور مزدوروں میں سے بہت کم ایسے ہیں جنکو حکمران جماعت میں شمولیت کا موقعہ مل سکے۔ بولشویک حکومت اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک مزدوروں اور غیر مزدوروں میں ایک حد فاصل موجود ہے۔

لیکن یہ حد فاصل بتدریج کم ہو رہی ہے۔ کسانوں اور تعلیم یافتہ جماعت پر جو سختیاں کی گئی تھیں ۳۱-۱۹۳۰ء میں انکی انتہا ہو گئی تھی۔ مگر جیسا کہ بولشویک دنیا کا شروع سے قاعدہ رہا ہے اس کے فوراً بعد ہی اشالین کی وہ مشہور تقریر سننے میں آئی (۲۳ جون ۱۹۳۱) جو تقریر شش نکات کے نام سے مشہور ہے اور جس کی رو سے تعلیم یافتہ طبقے کو آزادی کا پروانہ حاصل ہوا۔ اہل علم پر لطف و کرم کی بارش شروع ہوئی یہانتک کہ مہندسین کو بالآخر "مزدور" کا معزز لقب عطا ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی شہری اور دیہاتی آبادی کا استیصال شروع ہوا۔ پنج سالہ تجویز سے بہت پہلے شہری سرمایہ ختم ہو چکا تھا۔ البتہ دیہاتی سرمایہ داری

ابھی موجود تھی۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۹۱۷ء کا انقلاب بہت کچھ دیہاتیوں کی شمولیت کا نتیجہ تھا اور اسی زمانے میں تمام اراضیات کو قوم کی ملکیت قرار دیدیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود زراعت کا سارا نظام انفرادی کاشتکاروں کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اپنے اوزاروں اور کلوں کے مالک تھے۔ لہذا ۱۹۲۹ء میں سب سے پہلے کاشتکاروں کی انفرادیت کا خاتمہ کر دیا گیا اور ان کا تمام سرمایہ ریاست کی ملکیت قرار پایا اور ۱۹۳۵ء میں انھیں اپنے اپنے گاؤں کے جدید معاشی نظم ونسق کے مطابق سیاسی حقوق بھی دیئے گئے۔ بالفاظ دیگر اب کوئی زمیندار انفرادی سرمایہ کا مالک نہیں - وہ محسوس کرتا ہے کہ سودیٹ حکومت کا وجود فائدے سے خالی نہیں۔ لہذا اسے اشتراکین سے کوئی شکایت نہیں رہی۔ اگر یہ صحیح ہے تو اسے سیاسی امور میں بھی مساویانہ درجہ حاصل ہونا چاہئے۔ اہل حکومت کا خیال ہے کہ ان پر جس قدر اعتماد ظاہر کیا جائیگا ریاست سے انکی وفاداری بڑھتی جائے گی۔ اسٹالین نے اعلان کر دیا ہے کہ نئے جمہوری آئین کے ماتحت تمام اشتمالی عہدیدار اور صوبائی رہنماؤں کو از سر نو منتخب ہونا پڑے گا۔ اس خیال سے کہ انتخابات کے موقعہ پر تخویف اور دہشت انگیزی سے کام نہ لیا جائے۔ اب دیہات میں زراعت کی نگرانی ہر گاؤں کی عام مجلس کے سپرد ہے۔ جس کے اجلاس کے لئے اکثریت کی حاضری شرط ہے۔ یہ مجلس حکام کے فیصلوں کو رد کر سکتی ہے لیکن حکام کو اختیار نہیں کہ اس کے فیصلوں کو منسوخ کر سکے۔ اس لئے دیہاتیوں کو مزدوروں کی نسبت زیادہ جمہوریت حاصل ہوتی جائے گی۔ اور چونکہ مادی آسائشیں دن بدن بڑھ رہی ہیں لہذا جو فوائد اب تک صرف مزدوروں کو حاصل تھے۔ ان سے اہل دیہات بھی متمتع ہو رہے ہیں مارکس اور اینگل کا خیال تھا کہ ذہنی اور جسمانی محنت اور شہر اور قصبوں کا باہمی امتیاز ہمیشہ کے لئے اُٹھ جانا چاہئے۔ یہ بات ہے جو روس کی اجتماعیت، زراعت کے صنعتی نظام اور دیہاتیوں کی سیاسی ترقی کی بدولت دن بدن تکمیل کو پہنچ رہی ہے۔ بولشویک انقلاب کے نتائج میں یہ امر سب سے زیادہ تعجب خیز ہے کہ اشتمالی فریق نے اس جبری سیادت کو جو کسی زمانے میں گاؤں پر قائم ہوگئی تھی ارادی اشتراک اور منصفانہ تبادلے کی شکل میں بدل دیا ہے۔

شروع شروع میں جب اشتراکین کے مخالف عنصر ملک میں سرگرم کار تھے خود بولشویکوں کا خیال تھا کہ وطنیت محض ایک آڑ ہے جس کے پیچھے طبقات کا امتیاز ہمیشہ کام کرتا رہتا ہے لیکن ان مخالف عناصر کے اختتام کے ساتھ ساتھ اب یہ خیال بھی بدل رہا ہے۔ ۹ / جون ۱۹۳۲ء کو جب حکومت کے سرکاری اخبار "پراودا" نے "آبائی وطن" کے الفاظ استعمال کئے ہیں تو اس پر ہر شخص کو تعجب ہوا بعض

لوگوں کی رائے تھی کہ یہ جرمنی کی وطنی تحریک کا ردعمل ہے حالانکہ یہ صرف ایک علامت تھی اس تغیر کی جس کا رخ دن بدن جمہوریت کی طرف ہے بیرا او دا کے الفاظ یہ تھے "وہ ہمارا ملک اجتماعیت یافتہ کاشتکاروں، اشتراکی اہل علم اور مزدوروں کو جنہیں، اکروڑ نفوس شامل ہیں جان سے زیادہ عزیز ہے، اس تعداد میں روس کا ہر باشندہ شامل ہے جہاں باہمی امتیازات اور فرق مراتب دن بدن نابید ہو رہا ہے اور بولشویک تحریریں دن بدن لوگوں کو یقین دلا رہی ہیں کہ تمام روسیوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک قوم تصور کریں۔ لیکن اگر اشتمالی فریق بدستور حکومت پر متصرف رہا تو اس جمہوری تحریک کا فروغ پانا ممکن ہے جمہوریت کا تقاضا یہ ہے کہ ملک میں کسی ایک جماعت کا استبداد قائم نہ رہے۔ واقعات کی شکل بھی کچھ ایسی ہے ۱۹۱۷ء کے انقلاب میں لینن کے ساتھ صرف گنتی کے چند بولشویک تھے۔ اب اسی جماعت کے اراکین کی تعداد پچیس لاکھ بیان کی جاتی ہے۔ تخویف دہشت انگیزی، قتل، گرفتاریاں اور "او گ پو" (روس کا محکمہ خفیہ اطلاعات) کی دار و گیر میں اب وہ پہلا سا زور شور باقی نہیں رہا۔ اسٹالین کہتا ہے "بولشویکوں کی دو قسمیں ہیں۔ وہ بولشویک جو کسی جماعت میں شریک ہیں اور وہ بولشویک جن کی کوئی جماعت نہیں" یہ الفاظ نہایت درجہ معنی خیز ہیں۔ اسی طرح ۴ مئی ۱۹۲۵ء کو اسٹالین نے کریملن میں جو تقریر کی تھی، اس میں اس نے کہا تھا کہ ریاست کا تعلق عوام سے عجیب شرمناک ہے۔ ہمیں عورتوں اور مردوں کی امداد محبت اور ملاطفت سے کرنی چاہئے... انسان کا وجود ہر قسم کے سرمایہ سے زیادہ اہم اور قدر و منزلت کے لائق ہے۔" لیکن اسٹالین کے ان الفاظ کی حیثیت ابھی تک ایک وعدے کی سی ہے ملک کا تمام سرمایہ حکومت کے ہاتھ میں ہے اور سرکاری حکام جس طرح چاہیں اسے استعمال کرتے ہیں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ عقل و تمیز سے عاری ہیں۔ ان کا استبداد خلقت کے لئے غیر معمولی مصیبتوں کا باعث ہوا۔ یہ ٹھیک ہے لیکن روسی حکام اتنے بے بصر اور حسن توازن سے عاری نہیں تھے جس قدر انہیں مخالف عناصر کی کامیابی کا خوف تھا۔ اب روس میں یہ احساس دن بدن بڑھتا جاتا ہے کہ تخویف اور دہشت انگیزی کا وجود تہذیب و تمدن اور فنون لطیفہ ہی کے لئے نہیں بلکہ معاشی ترقی کے لئے بھی مضر ہے۔ پھر یہ بھی خیال ہے کہ اگر آئندہ جنگ ہوئی تو اس میں جو چیز کام دیگی وہ صرف حب الوطنی کا جذبہ ہے۔ لہذا اس خطرے نے سب سے بڑھکر جمہوریت کے لئے زمین طیار کر دی ہے۔ لیکن ابھی اس جمہوریت کا صرف خاکہ ہی قائم ہوا ہے۔ ملکی حقوق کے اعلان اور اشتمالی فریق کے متعلق حکومت کی پچھلی

روش کی تبدیلی سے آمریت کو کوئی خدشہ نہیں۔ اگر ہے تو محض اشتمالی (کمیونسٹ) فریق کو۔ یہ الگ بات ہے کہ اس قسم کے انقلاب کا تمام مسالہ فراہم ہو چکا ہے اگرچہ اس راہ میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ روس کی تاریخ جمہوری روایات سے خالی ہے۔ صدیوں تک یہاں ایک بے رحم، تاریک خیال اور غیر مہذب اور مطلق العنان نظام حکومت قائم رہا۔ کیرنسکی کو اگرچہ جمہوریت کا دعویٰ تھا۔ (۱۹۱۷ء) مگر اس نے ملک کی صریح و صاف رائے کے خلاف جنگ میں شرکت قائم رکھی۔ پھر لینن کا زمانہ آیا اور بولشویکوں نے "اوگپو" اور "چیکا" کے خوفناک حربوں سے کام لینا شروع کیا۔ موجودہ بولشویک حکومت کا یہ خیال ہے کہ انقلاب کے موقعہ پر غالباً ان کے بغیر کامیابی ناممکن ہوتی لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ جمہوریت اور آمریت باہم منافی ہیں۔ سرکاری طور پر اس وقت آمریت کے متعلق حکومت کی آئندہ روش کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ تحریر و تقریر اور اجتماعات پر ابھی تک قدیم پابندیاں بدستور عائد ہیں اور ریاست کے احکام بھی پوری مطلق العنانی سے نافذ کئے جاتے ہیں۔ بایں ہمہ "آمریت عوام اور اشتراکی جمہوریت" کے الفاظ سرکاری اخبارات میں استعمال ہونے لگے ہیں۔ اسٹالن کی مختلف تقریریں، "اوگپو" کی تنظیم نو اور فروری ۱۹۳۵ء کی آئینی اصلاحات کسی اور ہی تبدیلی کی خبر دیتی ہیں۔ "فرقہ دار" اور "غیر فرقہ دار بولشویک"، قوم اور انسان دوستی کی اصطلاحیں خالی از معنی نہیں۔ دنیا میں ابھی تک کوئی اشتراکی جمہوریت قائم نہیں ہوئی۔ لیکن اگر ایسا ہوا تو یقیناً اس کا ظہور جدید مسائل کا باعث ہوگا۔

کرنٹ ہسٹری

مراسلات

۱۔ جامع کوبے جاپان

ہمیں انجمن اسلامی جامع کوبے (جاپان) کی طرف سے میاں عبدالعزیز صاحب بیرسٹرایٹ لا (سابق صدر آل انڈیا مسلم لیگ) کا وہ خطبہ موصول ہوا ہے جو انھوں نے جامع کوبے کا افتتاح کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ جاپان کرانیکل کوبے (اشاعت ۷ نومبر ۱۹۳۵ء) کا بیان ہے کہ اس تقریب پر اسلامیان کوبے کے علاوہ میئر کوبے برطانوی اور مصری قنصل، جاپانی اور غیر جاپانی ملتوں کے مخصوص نمائندے موجود تھے۔ میاں صاحب نے اپنا خطبہ پڑھتے ہوئے عربی وضع کا جو لباس پہن رکھا تھا جو مدینہ منورہ میں طیار ہوا اور جسے حاجی داؤد ہاشم محمد یوسف رنگونی نے خاص طور پر اس موقعہ کے لئے پیش کیا تھا۔ میاں صاحب کے خطبہ افتتاحیہ کے بعض ضروری اقتباسات درج ذیل ہیں

حاضرین کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میاں صاحب نے کہا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ جاپانی زبان میں کوبے کے معنی خدا کے دروازے کے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ جس کسی نے اس مقام کا نام کوبے تجویز کیا تھا اس کا کیا مطلب تھا لیکن میں یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ "خدا کے دروازے" سے آدمی کو خدا کے گھر ہی میں داخل ہونا چاہئے جہاں آج ہم سب جمع ہیں ....."

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اور مسلمانوں نے اکثر غیر زمینوں میں اپنے دن گذارے ہیں۔ ممکن ہے آج سے صدیوں پہلے عرب جہازراں ان جزائر میں آئے ہوں۔ پھر چین کے مسلمانوں نے بھی یہاں کا رخ کیا ہوگا۔ لیکن یہ سب تاجر تھے یہ موقعہ اب آیا ہے کہ یہاں مسلمانوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوگیا کہ وہ اپنے لئے ایک مسجد کی تعمیر ضروری سمجھیں اسوقت جو لوگ جمع ہیں وہ اگرچہ نسلاً اور وطناً ایک دوسرے سے ناآشنا ہیں۔ کیونکہ یہاں چینی مسلمان بھی ہیں اور ہندی بھی اور وہ مسلمان بھی جو سواحل نیل، روس، ملایا، اور ترکی سے آئے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی زبان نہیں جانتے لیکن ان کے اندر ایک روحانی اتحاد قائم ہے۔ وہ ایک خدا اور ایک رسول کے نام لیوا ہیں اور ایک ہی کتاب انکی ہدایت اور رہنمائی کرتی ہے ......"

حضرات جاپان میں اس مسجد کی تعمیر اسلامیان جاپان کی دینی ضروریات کے علاوہ اس سرزمین میں اسلامی

تعلیمات کی اشاعت کے لئے بھی نہایت مفید ثابت ہوگی ... مجھے یقین ہے کہ اسلامی ممالک اس کے قیام و انتظام کا خیال رکھیں گے۔ اور ہم عنقریب توکیو میں بھی ایک شاندار مسجد تعمیر کر سکیں گے۔ یہ تجویز مناسب ہے کہ اس مسجد کے ساتھ ایک دارالمطالعہ اور ایک کتب خانہ بھی قائم کیا جائے جس کا اجتماع مفید تقریروں اور خطبوں کے لئے نہایت موزوں ہوگا۔"

اسلامی تعلیمات، اس کے دینی اور روحانی حقائق اور اسلام کی وسیع المشربی اور عالمگیر ذہنیت کا ذکر کرنے کے بعد میاں صاحب نے کہا میں اپنے ان جاپانی بھائیوں کا خاص طور سے ممنون ہوں جو اس وقت یہاں تشریف فرما ہیں میں ان کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس دن کا منتظر ہوں جب وہ جوق در جوق ہمارے دین میں شامل ہوتے چلے جائیں گے خدا کرے وہ دن جلد آئے جب جاپان میں ایک مسجد نہیں بلکہ ہزار ہا مسجدوں کے مینار اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھیں۔ حضرات اس وقت ہم چند سو آدمی یہاں جمع ہیں۔ آیئے ہم دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان چند سو کو چند ہزار اور چند ہزار کو لاکھوں کی تعداد میں وسیع کردے اور اس طرح یہ سرزمین نور توحید سے منور ہو جائے ..."

۲۔ ایک پنجاہ سالہ تجویز

اچھوت اقوام کس طرح دائرہ اسلام میں شامل ہوں

(ا) ایک تبلیغی انجمن تمام ہندوستان کے ہریجنوں کے لئے

(ب) ایک کروڑ کا ایک وقف بطور سرمایہ

(ج) ایک ہزار دوامی معاونین

(د) ایک لاکھ دوامی اراکین

(ہ) ایک ہزار دوامی مبلغ

از راغب احسن ایم۔ اے سکرٹری آل انڈیا مسلم یوتھ لیگ

ہمیں جناب راغب احسن صاحب کی طرف سے انکی ایک اسکیم موصول ہوئی ہے جو پچھلے نومبر میں سالہ حمایت اسلام لاہور میں شائع ہوئی تھی اور جس کو معاصرین انقلاب، مدینہ، اور خلافت نے خاص طور پر پسند کیا۔ راغب صاحب کا خیال ہے کہ ہندوستان میں اچھوت اقوام کا مسئلہ ہر جگہ ایک ہی حیثیت رکھتا ہے۔ مختلف مقامات میں جو فرق پایا جاتا ہے اس کے لئے مقامی انجمنوں کو الگ اختیار دیئے جاسکتے ہیں لیکن ہریجنوں کو اسلام میں داخل کرنے کے لئے ایک ہی انجمن ہونی چاہئے جس کا نظم و نسق ایک وفاق کا سا ہو اور تمام ہندوستان میں اس کی شاخیں پھیلادی

بابئیں۔ راغب صاحب نے اپنی اسکیم کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہم ان کی خواہش پر اس کا ملخص ذیل میں درج کرتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ دردمندان قوم اس اہم مسئلے کے متعلق جسے سیاسیات ہند میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے۔ کانگریس اور گاندھی جی نے اس بارے میں جو روش اختیار کی تھی اس کا تقاضا یہ کہ مسلمان اچھوت اقوام کی اصلاح و امداد کو محض ہندوؤں تک محدود رہنے دیں۔ دینی اعتبار سے مسلمانوں کا ایسا کرنا جس قدر غلط ہوگا اس کی تشریح بے سود ہے لیکن بعض "نیشنلسٹ" مسلمانوں کے اس طریق عمل کے باوجود کہ وہ ہر ممکن طریق پر گاندھی جی کی خوشنودی حاصل کریں خود ہریجنوں کے عزم بغاوت کے ساتھ (ہندو مذہب ہے) یہ بات ہر شخص کی سمجھ میں آتی جاتی ہے کہ اب مسلمان اس میدان میں جرأت کر کے آگے بڑھیں اور کسی ایسے مغالطے کا خیال نہ کریں جو ہمارے خودغرض دوست "آزادی" اور "وطن" کا نام لے کر پھیلایا کرتے ہیں۔ قارئین طلوع اسلام سے مکرر درخواست ہے کہ وہ راغب صاحب کی اسکیم اور اچھوت اقوام کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں

راغب صاحب کی اسکیم کا ملخص یہ ہے

۱۔ ہریجنوں میں تبلیغ اسلام کے لئے ایک ایسی انجمن قائم کی جائے جس کی شاخ تمام ہندوستان پر محیط ہو اس انجمن کا مرکز بمبئی یا مدراس میں ہونا چاہئے۔

۲۔ ہریجنوں میں تبلیغ اور مساجد اور مکاتب کے ذریعہ انہیں اسلامی معاشرت سکھلانے کے لئے کم از کم پچاس سال کی ضرورت ہوگی۔

۳۔ تبلیغ کا یہ مطلب نہیں کہ اچھوت اقوام کو محض کلمہ لا الہ الا اللہ سے آشنا کر دیا جائے۔ ان کے لئے مساجد اور مدارس کا انتظام کرنا پڑے گا۔ اور اس امر کی ضرورت ہوگی کہ وہ اپنی معاشرت اور کاروباری زندگی یعنی حصول معاش میں قطعی طور پر ہندوؤں سے آزاد ہو جائیں۔ اسلام کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلمانوں میں جذب ہو جائیں

۴۔ کامیاب تبلیغ کے لئے اس امر کی ضرورت ہے کہ ایک ہزار مسلمان اپنی زندگی تبلیغ کے لئے تبلیغ کا عہد لیں اس طرح ایک ہزار سرگرم مبلغین کی ایک فوج طیار ہو جائے جس کا ہر رکن کم از کم بیس سال تک اپنی خدمات وقف کر دے انجمن کو چاہئے کہ قیام اور سفر خرچ کے علاوہ مبلغین کو ایک سو روپے سے دو سو روپے تک ماہوار تنخواہ دے علاوہ ازیں پیرانہ سالی میں انھیں پنشن کا حق بھی حاصل ہو۔

۵۔ یہ مبلغ پانچ قسم کے ہونگے۔

(ا) ناظمین — یعنی انجمن کے نگران اور منتظم

(ب) ناصرین — انجمن کے اراکین اور معاون

(ج) معلمین — یعنی " مولوی " جو دینیات کی تعلیم سے فارغ ہو چکے ہیں اور تبلیغی خدمات انجام دینگے۔

(د) مناظرین — تعلیم یافتہ اور شہری ہریجنوں میں تبلیغ کے لئے جدید خیالات سے واقف " مولوی "

(ہ) مبلغین — خود ہریجنوں کے اندر سے قابل اور ہوشیار مبلغ طیار کرنا۔

۶۔ مبلغین کی طیاری کے لئے مختلف مراکز میں تعلیمی مدارس کی ضرورت ہوگی، جہاں مختلف زبانوں تاریخ، نفسیات اور اچھوت اقوام کے قصے کہانیوں اور روایات کی تعلیم دی جائے۔

اس سلسلے میں ایک کروڑ روپے کا ایک مستقل وقف بھی قائم کرنا ہوگا تاکہ انجمن کو سرمائے کی فکر نہ رہے۔

۷۔ تمام ہندوستان میں سے ایک لاکھ اراکین کو اس انجمن کی تاسیس میں حصہ لینا چاہیے جو صرف زر داخلہ اور ایک روپیہ ماہوار چندہ دیں۔

ایک ہزار دولتمند مسلمانوں کو انجمن کا سرپرست بننا چاہیے ان کا فرض ہے کہ ایک ہزار کی ایک رقم بطور عطیہ اور ایک سو روپیہ ماہوار چندہ ادا کریں یا ایک ہزار روپے کے بدلے ایک ہزار کی جائداد وقف کریں انجمن کی مالیاتی مجلس کو باقاعدہ رجسٹر کرانا چاہیے، ضروری ہے کہ اس میں قوم کے معتمد اور سمجھدار لوگ شامل ہوں علی ہذا پانچ ماہرین کی ایک مستقل اور تنخواہ دار مجلس کو انجمن اور وقف کے مصارف کی نگرانی اور انتظام کرنا چاہیے۔

علمی ادبی منتخب کتابیں

غالب مصنفہ ڈاکٹر عبداللطیف صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ مترجمہ سید معین الدین صاحب قریشی ایم۔ اے۔ مرزا غالب کے کلام پر مختلف خیالات ظاہر کئے گئے ہیں ان کے پیچیدہ اشعار کی طرح طرح پر تشریحات اور تاویلیں کی گئیں ہیں مگر جس نفاست اور غیر جانبداری سے ڈاکٹر صاحب نے تنقید و تبصرہ کیا ہے وہ انہیں کا حق تھا۔ آپ نے غالب کے کلام پر ایسی تحقیق، تدقیق اور صاف گوئی سے کام لیا ہے کہ غالب کی کلام فہمی کے لئے ایک نئے باب کا انکشاف ہوتا ہے صـ۱۲۴ قیمت عہ

جنگ روس و جاپان مولانا ظفر علی خان صاحب بی اے کا مشہور زریں ڈرامہ روس و جاپان کی لڑائی کے حالات کا قابل دید مرقع صـ۹۶ ، قیمت عاَر

خیابان فارس مترجمہ ایضاً۔ لارڈ کرزن کے خود نوشتہ سفرنامہ پرشیا اینڈ دی پرشین کوئسچن ،، کا باتصویر اور مشہور و معروف اردو ترجمہ۔ ایران کی تاریخ اور قلمرو ایران کے چشم دید حالات، ایران کے سیاسی اور خارجی معاملات جغرافی، تمدنی اور دیگر حالات کی تحقیق اور ان پر تبصرہ، انگلستان اور ایران کے تعلقات وغیرہ پر دلچسپ بحثیں صرف چند نسخے رہ گئے ہیں صـ۶۱۲ مجلد قیمت سے

معرکہ مذہب و سائنس مترجمہ ایضاً۔ ڈاکٹر جان ولیم ڈریپر کی ایک معرکۃ الآرا تصنیف کا سلیس اردو ترجمہ، سائنس کی ابتداء، ترقی، مذہب و سائنس میں نزاع، ماہیت روح ماہیت عالم اور انتظام عالم وغیرہ، قابل دید مباحث ضمناً اکثر ممالک کی تاریخ وہاں کی سیاسیات اور بڑے بڑے مذاہب اسلام عیسائیت اور ہندو مت پر زبردست بحثیں اور ہر ایک کی فلسفیانہ تحقیق اور ان سب کا سائنس کی موجودہ ترقیوں سے مقابلہ صـ۴۰۶ قیمت چار روپے۔

مسلمان اور شادی از ابوالمعظم قاضی سید عبدالغفار صاحب ہندوستان میں خصوصاً مسلمانوں میں شادی بیاہ کے متعلق غلط رسومات، غیر شرعی طریقے اور بہت کچھ رواج رائج ہو گئے ہیں جو طرح طرح کی معاشرتی اور سیاسی پیچیدگیوں اور رکاوٹوں کے باعث ہو رہے ہیں مسلمانوں کو ان کے خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے قاضی صاحب کی پر درد اثر اور خلاق سے پر اور خون کے آنسو رلانے والی کتاب نہایت مفید ثابت ہو رہی ہے شادی بیاہ کے متعلق ہر امر پر اصلاحی اور تعمیری روشنی ڈالی گئی ہے اس کا مطالعہ ہر مسلمان کے لئے لازمی ہے صـ۱۶۵ قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ

صلاح کار از ایضاً۔ یہ کتاب مسلمان اور شادی کی دوسری کڑی ہے اس تصنیف میں بھی مصنف نے اپنے رقت خیز قلم سے ایسی باتیں تحریر فرمائی ہیں جن کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی ازدواجی زندگی ایک کامیاب اور مرفہ الحالی کی زندگی ثابت ہو۔ اس کتاب میں نفسیاتی اصول کو پیش نظر رکھ کر زن و شوہر کے فطری خصائص و امتیازات، ان میں میل و ملاپ، یکسانیت و یگانگت پیدا کرنے کے حقائق پیش کئے گئے ہیں صـ۲۱۴ قیمت ایک روپیہ عہ

مہر تاباں از ایضاً۔ یہ قاضی صاحب کے مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ ہر مضمون میں اصلاح اور اضافہ معلومات دینی و دنیوی کے رموز پنہاں ہیں۔ ادب و لطائف کی چاشنی نے مضامین کو زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے صـ۴۵ قیمت چار آنہ (۴ر)

کسب معیشت از شیر امجد صاحب۔ روپیہ کے حصول اور اس کے صحیح استعمال میں عمدہ فنی کتاب ہے ۱۱۴ صفحات قیمت ۱۲ ار

کشکول یعنی بیاض اصفر، مرتبہ راجہ راجیشور راؤ صاحب اصغر یہ کتاب اُن صدہا فارسی و اردو ابیات و اشعار کا مجموعہ ہے جو فاضل مولف کی برسوں کی مدت مطالعہ میں انتخاب ہوئے ہیں صفحات کے حاشیہ میں اشعار کے ساتھ شاعر کا تخلص بھی درج ہے۔ قدر شناسان شعر و سخن و مشتاقان ادب لطیف کے لئے بیش قیمت تحفہ ہے صـ۴۲۰ قیمت تین روپے۔

ہوش کے ناخن از میر حسن صاحب بی۔ اے و مخدوم محی الدین صاحب بی۔ اے یہ ایک ڈراما ہے جس میں حیدرآباد دکن کی سماجی زندگی کے بعض مخصوص پہلوؤں کو نہایت لطیف پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے صـ۹۶ قیمت دس آنے۔

مسدس سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ از نواب قطب یار جنگ بہادر۔ بی۔ اے۔ ترکی کے مشہور فاتح سلطان محمد کے معرکہ آرائیوں پر یہ ایک دلکش نظم ہے جس کو مولانا حالی نے بہت پسند کیا تھا صـ۶۳ ۱۲ر

ہندستانی لسانیات از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں علم لسان کے مقاصد، فوائد، تاریخ، زبان کی ماہیت، ارتقاء و تشکیل سے متعلق عام اور اصولی معلومات فراہم کر کے دنیا کی زبانوں کی تقسیم، ان کے خاندان اور خاصکر ہندوستان کی زبانوں پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں اردو کے آغاز و ارتقاء، اردو کی بولیوں اور اس کی ہمہ گیری پر جدید ترین تحقیقات پیش کر کے اردو ہندی کے جھگڑے اور اردو کے جدید رجحانوں اور ضرورتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے صـ۱۲۰ عاَر

فن انشاپردازی از ایضاً اس میں اردو انشاپردازی اور تصنیف و تالیف میں کامیابی کرنے کے ابتدائی اصول اور عملی طریقے بیان کئے گئے ہیں۔ اس کو بخوبی مطالعہ

کرنے کے بعد ایک مبتدی کامیاب انشا پرداز مصنف بن سکتا ہے اور اپنے بہت سے دانستہ یا نادانستہ نقائص کی اصلاح کرکے ایک پختہ کار اور کہنہ مشق اہل قلم کی خصوصیات پیدا کر سکتا ہے اردو زبان میں اپنے موضوع اور وسعت معلومات کے لحاظ سے سب سے پہلی اور فنی کتاب ہے صفحات ۱۱۶ قیمت ایک روپیہ چار آنہ۔

عہد عثمانی میں اردو کی ترقی از ایضاً گذشتہ پچیس سال سے حیدرآباد دکن میں اردو زبان و ادب کے نشوونما کا تذکرہ ہے اس میں اعلحضرت شاہ دکن سلطان العلوم کی اردو زبان سے ذاتی دلچسپی، اردو نوازیوں اور سرپرستی کے اثرات کا حال بالتفصیل درج ہے صہ ۳۰۶ مجلد قیمت عہ

حیدرآباد دکن کی تعلیمی ترقی گذشتہ ربع صدی میں

از محمد عبدالقادر صاحب سروری پروفیسر جامعہ عثمانیہ۔ اس کتاب کے ذریعہ مرتب نے موجودہ زمانہ میں حیدرآباد کی عام تعلیمی ترقی، اس کی اشاعت اور توسیع کا خاکہ پیش کیا ہے گذشتہ زمانہ کی تعلیمی تاریخ بھی بالاختصار بیان کی گئی ہے اور ارتقائے تعلیم کے دو دور معین کئے گئے ہیں۔ کتاب کے مضامین تمہید کے سوا، آٹھ ابواب پر مشتمل ہیں، مسائل تعلیم کی دلچسپی رکھنے والے اصحاب کے لئے اس کا مطالعہ اضافہ معلومات کا باعث ہوگا صہ ۱۴۰ مجلد قیمت عہ

عصر جدید از جانکی پرشاد صاحب عہد عثمانی میں حیدرآباد دکن کی ترقیوں کا اجمالی بیان ہے۔ اعلحضرت کے مختصر حالات بیان کرنے کے بعد حیدرآباد کے جملہ اصلاحات، تبدیلیوں اور ترقیوں کا حال اس عمدگی کے ساتھ ترتیب وار لکھا گیا ہے کہ موجودہ حیدرآباد کی پوری تاریخ و کیفیت معلوم ہو جاتی ہے صہ ۱۸۸ مجلد ایک روپیہ

اسٹار ڈائرکٹری مملکت حیدرآباد دکن یہ حیدرآباد دکن کی نہایت مکمل اور مفصل ڈائرکٹری ہے۔ اس میں جملہ معلومات سرکاری، تجارتی و تاریخی درج ہیں۔ یہ ڈائرکٹری اگر آپ کے ہاتھ میں ہو تو خواہ آپ کی ضرورت کسی قسم کی ہو نہایت آسانی سے تکمیل کر سکتے ہیں۔ خاندان شاہی عمائد سلطنت، اعلیٰ عہدہ داران، مشہور مقامات کے بیسیوں عکسی تصاویر درج ہیں مختصر یہ کہ اس کتاب میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ایک ڈائرکٹری میں ہونا چاہئے خاصکر حیدرآباد کے باہر رہنے والوں کے لئے تو یہ کتاب خضر راہ ہے آخر میں حیدرآباد کی ضروری معلومات کے متعلق رنگین نقشے دیئے گئے ہیں۔ کتابت طباعت کاغذ نہایت عمدہ صہ ۵۲۰ للعہ

حشرات الارض از فضل الرحمن صاحب بی۔ اے (آنرز) یہ جدید طرز کا چار ایکٹ میں ایک بہترین ڈرامہ ہے جو حیدرآباد کے اسٹیج پر متعدد مرتبہ پیش ہو کر عامۃ الناس سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے صہ ۱۹۳ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

ظاہر و باطن از ایضاً۔ یہ بھی جدید طرز کا پانچ ایکٹ میں نہایت دلچسپ ظریفانہ ڈرامہ ہے اس کا پلاٹ مشہور مغربی ڈرامانویس شریڈن کی طربیہ "دا اسکول فار اسکینڈل" سے اخذ کیا گیا ہے اور متعدد مرتبہ کامیابی کے ساتھ حیدرآباد کے اسٹیج پر پیش کیا گیا ہے صہ ۱۸۳ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ۔

نئی روشنی از ایضاً یہ بھی پانچ ایکٹ کا نہایت لطیف مذہبی ڈرامہ ہے اس کا پلاٹ شریڈن کے دی رائیولز سے لیا گیا ہے یہ بھی اسٹیج پر پیش کیا جا چکا ہے صہ ۱۵۶ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ

پردہ از ایضاً موجودہ پردہ کے متعلق افراط و تفریط سے بچنے کے لئے ایک اصلاحی اور معاشرتی ڈراما ہے صہ ۱۰۸ قیمت عہ

مہابھارت از راجہ راجیشور راؤ صاحب اصغر اردو زبان میں مہابھارت کی کہانی کو سلیس اردو انداز میں بیان کیا گیا ہے باتصویر صہ ۲۱۶ قیمت عہ

مآثر دکن دکن کے آثار قدیمہ اور خاصکر شہر حیدرآباد کے مشہور اور تاریخی اور قدیم عمارات کے حالات اور تصاویر حیدرآباد کی گائڈ کے طور پر شائع کئے گئے ہیں از سید علی اصغر صاحب بلگرامی صہ ۱۵۲ قیمت چار روپے

سلیم از محمد امیر صاحب بی۔ اے پروفیسر وحید الدین سلیم کی زندگی انشاپردازی اور شاعری پر ایک بسیط تبصرہ ہے صہ ۲۰۳ قیمت ایک روپیہ

عشق و محبت مرتبہ تصدق حسین تاج اردو ادبیات میں ادب لطیف کا سب سے پہلا منظوم شاہکار ہے جو عرصہ کی چھان بین اور تلاش کا نتیجہ ہے اردو ادب کے دور گذشتہ کے چند چوٹی کے شعرا خصوصاً آزاد اور حالی سے لیکر اس وقت تک کے (۸۴) سے زائد اور تمام مشہور و معروف شعرا کی ایسی نظموں کا انتخاب جس میں صرف عشق و محبت جیسے لطیف اور موثر جذبہ کی حقیقی ترجمانی کی گئی ہے مختصر یہ کہ جدید دور شاعری کے تمام حسن کا راز نظموں کا بہترین مرقع طباعت عمدہ صہ ۲۳۲ مجلد قیمت عا

مئے دو آتشہ مرتبہ سید محمد علی صاحب بلگرامی بی۔ اے۔ یہ حکیم المشرق عمر خیام کی فارسی رباعیات اور انکے انگریزی اور اردو ترجمہ کا مجموعہ ہے انگریزی ترجمہ مسٹر ون فیلڈ کا ہے اور اردو سید احمد حسین صاحب شوکت بلگرامی کا حکیم عمر خیام اور شوکت کی تصاویر بھی ہیں۔ عمر خیام کی شاعری اور اس کے ترجمہ کی قدر و قیمت اور شوکت کے کامیاب ترجمہ پر بسیط مقدمہ اور بلند پایہ ادیبوں کی رائیں درج ہیں صہ ۱۵۱ قیمت عہ

عراق و ایران از نواب اسد علی خاں بہادر۔ یہ نہایت مکمل اور جامع سفرنامہ ہے ضروری معلومات کے سوا، مختصر تاریخی و جغرافیائی حالات، معاشرتی اور اجتماعی زندگی کی صحیح تصویر اور طریق حکومت وغیرہ کا مفصل بیان ہے۔ دو نقشے اور مقامات مقدسہ کے (۴۶) فوٹو شریک ہیں صہ ۳۱۹ مجلد صہ

سیاہ کار عورتیں از مرزا حسین احمد بیگ صاحب بی۔ اے ناظم عدالت۔ یورپ اور امریکہ کی عاشق مزاج و جرائم پیشہ عورتوں کے سچے اور عبرت خیز حالات بالتصویر صہ ۱۰۲ مجلد قیمت ۱۲ر

پردیس کی باتیں از الیفا یورپ ... ترین سفرنامہ ... مقامات کے متعلق تفصیلی معلومات، معاشرت، سیاست اور مذہبی حالات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ یورپ میں تحریک عریانی کے چشم دید حالات قلمبند کئے گئے ہیں شروع سے آخر تک کتاب دلچسپیوں کا ایک مجموعہ ہے متعدد تصویریں شریک ہیں پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوگیا یہ طبع دوم ہے صفحہ ۳۴۹، مجلد قیمت تین روپے

انوکھا حاجی از الیفا ایک انگریز سیاح دیول کے سفرنامہ حجاز کا ترجمہ دلکش طرز بیان دلچسپ حالات دلآویز لطائف و ظرائف اسلامی رسم و رواج اور تمدن و معاشرت پر ایک انگریز کے خیالات قابل دید کتاب ہے صفحہ ۲۴۳ قیمت عمار

مقدمات عبدالحق یعنی مولوی عبدالحق صاحب بی اے معتمد انجمن ترقی اردو اورنگ آباد کے کل عالمانہ و ادیبانہ مقدمات کا مجموعہ جس میں فلسفہ مذہب تاریخ و تذکرہ زبان ادب اور دیگر مختلف موضوعات پر بسیط مقدمے ہیں اور ہر مقدمہ بجائے خود ایک مقالہ ہے۔ دو حصے صفحہ ۶۲۰ قیمت صہ

تنقیدات عبدالحق یہ مولوی صاحب موصوف کی ان تنقیدات کا مجموعہ ہے جو رسالہ اردو میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی ہیں، جلد دوم تنقیدات شائع کی گئی ہیں صفحہ ۱۷۹ قیمت عہ

معاشقۂ نپولین فرانس کے مشہور تاجدار اعظم اور شہنشاہ نپولین بوناپارٹ کی حیات معاشقہ، فرانس کے ایک ادیب کا شاہکار اور ملک کے مشہور انشاپرداز سید ... محمد عبدالمنعم سعیدی کا عمدہ ترین ترجمہ لکھائی چھپائی عمدہ آٹھ ہاف ٹون بلاکس صفحہ ۴۹ مجلد ایک روپیہ۔

تین شاعر از ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ریڈر و پروفیسر جامعہ عثمانیہ میر تقی میر انیس اور مومن ... ان تینوں باکمال شعرا کی شاعری پر تنقید صفحہ ۱۲۵ مجلد قیمت ایک روپیہ

مثنوی تغلق نامہ مرتبہ سید ہاشمی صاحب فرید آبادی امیر خسرو کی وہ معرکۃ الآرا تاریخی مثنوی جس میں سلطان قطب الدین خلجی کے قتل حسن خسرو خان کے غصب سلطنت ملک تغلق کی معرکہ آرائی فتح اور تخت نشینی کے عینی واقعات حیرت انگیز صحت و تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں یہ مثنوی کئی صدی سے مفقود تھی محض حسن اتفاق سے حال میں برآمد ہوئی اور مجلس مخطوطات فارسیہ کی جانب سے تہذیب و تحشیہ کے بعد مجلد شائع کر دی گئی ہے شروع میں بہ لحاظ معلومات مقدمہ اور مثنوی کے تمام واقعات کا خلاصہ اردو میں تحریر ہے صفحہ ۱۵۱ قیمت چار روپے۔

دیوان حسن سنجری دہلوی (فارسی)، حضرت امیر خسرو کے دوست اور معاصر شاعر حضرت امیر حسن سنجری کا کلام جو متفرق طور پر زبان زد خاص و عام تھا اور آج تک طبع نہیں ہوا تھا کئی قلمی نسخوں کے مقابلے کے بعد بسرپرستی مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر صدر اعظم ریاست حیدرآباد دکن شائع ہوا۔ ابتدا میں مولوی مسعود علی صاحب محوی بی۔ اے کا پر مغز دیباچہ شریک ہے جس میں شاعر کی حیات اور اس کے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے صفحہ ۴۳۷، قیمت مجلد سات روپیہ۔

یورپ میں دکھنی مخطوطات از محمد نصیر الدین صاحب ہاشمی اس میں اُن دکھنی مخطوطات کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے جو انگلستان، اسکاٹلینڈ اور پیرس کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔ دکن کے مصنفین کے حالات اور نمونہ کلام کے ساتھ متفرق اردو فارسی نسخوں کے اختلافات بھی پیش کئے گئے ہیں صفحہ ۵۱۲ قیمت للعہ

صوت تغزل علامہ علی حیدر نظم طباطبائی کے قدیم و جدید کلام کا مجموعہ جس کو صاحب مغز ہی نے ترتیب دیا تھا۔ کلام تعریف و توصیف سے بالاتر ہے صفحہ ۳۵۸ عا دو روپیہ

فلسفہ ازدواج از سید علی اصغر بلگرامی جنسیات کے متعلق نہایت مفید مستند اور بہترین کتاب ہے مرد و عورت کے لئے ازدواجی زندگی کا مکمل رہنما ہے صفحہ ۱۳۲ قیمت ۸

تربیت حافظہ مصنفہ ایچ آر لینیٹ مترجمہ سید منظور احمد صاحب۔ حافظہ کی تربیت کی تجویزوں اور ترکیبوں کے متعلق اردو زبان میں واحد کتاب ہے صفحہ ۹۶ قیمت ایک روپیہ

نیز ہمارے یہاں اردو ادب کے قدیم و جدید مشہور مصنفین کی جملہ کتابیں موجود رہتی ہیں اور مشہور علمی ادبی و قلمی رسائل کی ایجنسیاں بھی قائم ہیں ہمارے ہاں کی جملہ فہرستیں طلب فرمانے پر مفت روانہ کی جاتی ہیں۔

مہتمم مکتبہ ابراہیمیہ لمیٹڈ عابد روڈ حیدرآباد دکن